آوازِ یوسفی

اور

دیگر مضامین

مرد کی آنکھ اور عورت کی زبان کا دم
سب سے آخر میں نکلتا ہے۔
مشتاق احمد یوسفی

مشتاق احمد یوسفی

ترتیب

ڈاکٹر مظہر احمد

اقوالِ یوسفی

اور

دیگر مضامین

مشتاق احمد یوسفی

ترتیب

ڈاکٹر مظہر احمد

کتاب : اقوال یوسفی

مصنف : مشتاق احمد یوسفی

مرتبہ : ڈاکٹر مظہر احمد

مطبع : ایچ ایس آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی۔

ناشر : ایم۔آر۔پبلی کیشنز

10 میٹروپول مارکیٹ، 25-2724 کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی

Aqwal-e-Yousufi

by

Mushtaq Ahmed Yousufi

Compiled by

Dr. Mazhar Ahmed

Cell: 09212089910 E-mail: mazhar_talat@yahoo.co.in

ISBN: 978-93-83282-50-0
Edition :2014

Price: **₹ 150/-**
Library Edition: ₹. 275/-

Printed & Published by

M. R. Publications

Printers, Publishers, Book Sellers & Distributors of Literary Books

10 Metropole Market, 2724-25 First Floor
Kucha Chelan, Daryaganj, New Delhi-110002

Cell: 09810784549, 09873156910 E-mail: abdus26@hotmail.com

عاشقانِ یوسفی کے لیے

Our Distributors

Delhi/New Delhi
Kutub Khana Anjuman Taraqqi Urdu, 011-23276526
Maktaba Jamia Ltd., 011-23260668
Ahluwalia Book Depot, 09818441306
Al-Balagh Publications, 09971477664
Nai Kitab Publishers, 011-65416661

Ahmedabad
Amreen Book Agency, 08401010786, 09898102956

Aurangabad
Mirza World Book House, 09325203227

Nagpur
Haneef Book Depot, 0712-2722546, 09823237556

Aligarh
Educational Book House, 09358251117
Maktaba Jamia Ltd., 0571-2706142

Allahabad
Shabkhoon Kitab Ghar
0532-3295063, 09450615881

Mumbai
Maktaba Jamia Ltd., 022-23774857
Kitab Daar, 022-23411854, 09869321477
Saifi Book Agency, 09820480292
Siddiqai Book Depot, 022-23455652
Aqsa Book Depot, 022-23454730
Abdus Salam Qasmi, 09322603836

Hyderabad
Huda Book Distributors, 09849330850, 040-24514892

Kolkata
Usamania Book Depot, 09433050634, 09433050635

Srinagar, J & K
Maktaba Ilm-o-Adab 09419407522, 0191-2482371

Jammu, J & K
Qasmi Kutub Khana 09797352280

Kerala
Payam Publications 09946705110

فہرست

پیش گفتار

صاحب طرز ظرافت نگار مشتاق احمد یوسفی کی تادم تحریر چار مطبوعات منظر عام پر آئی ہیں۔ پہلی کتاب بعنوان ''چراغ تلے'' ۱۹۶۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ دوسری تخلیق ''خاکم بدہن'' تقریباً دس سال بعد ۱۹۷۰ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی۔ تیسری کتاب ''زرگزشت'' کے عنوان سے ۱۹۷۶ء میں اشاعت کے مراحل سے گزری اور آخری شاہکار بعنوان ''آبِ گم'' ۱۹۹۰ء میں منظر عام پر آیا یعنی تقریباً چوبیس سال قبل ان کی اب تک کی آخری کتاب شائع ہوئی اور تب سے ہی ان کی اگلی کتاب کا بے چینی سے انتظار ہو رہا ہے۔ یہ عرصہ طویل بلکہ طویل تر ہے۔ اس دوران پاکستان سے چند خوشگوار خبریں بھی موصول ہوتی رہیں۔ آبِ گم کے پیش لفظ میں یوسفی نے یہ مژدہ سنایا تھا کہ اسی نوع (آبِ گم) کے پانچ مضامین اور موجود ہیں۔ امید تھی کہ یہ مضامین بھی شیرازہ بندی کے مراحل سے گزریں گے۔ مگر بوجوہ ایسا نہ ہو سکا۔ پھر خبر آئی کہ ایک ناول تیار ہے اور اسے پبلشر کے حوالے بھی کر دیا گیا ہے۔ بعدازاں یوسفی اسے ''پال'' میں لگانے کے لیے واپس لے آئے۔ عاشقانِ یوسفی کے انتظار کے لمحے دنوں، مہینوں سے برسوں پر محیط ہو گئے۔ اس دوران مشتاق احمد یوسفی پر چند کتابیں بھی منظر عام پر آئیں جن میں راقم الحروف کی کتاب (صاحبِ طرز ظرافت نگار مشتاق احمد یوسفی) کے علاوہ ڈاکٹر محمد طاہر اور طارق حبیب کی کاوشوں کی ستائش بھی ہوئی، مگر یوسفی کی تخلیقی سوغات کا انتظار طویل سے طویل تر ہوتا گیا اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ اُمید ہے کہ جلد ہی طنز و مزاح کے ادبی خزانے میں یوسفی بیش بہا اضافہ کریں گے۔

یوسفی کے فکر و فن کا جائزہ لینے والے فاضل نقادوں نے ان کے فن کی ایک اہم خصوصیت پر روشنی ڈالی ہے اور وہ ہے جملہ سازی کا فن، اور اس فنی جہت نے یوسفی سے متعدد اقوال قلم بند کروا لیے ہیں۔ رشید احمد صدیقی کی طرح یوسفی بھی اپنے طنز و مزاح کو اقوال زریں سے سجاتے اور سنوارتے

ہیں۔ان کے یہ قول ان کی کہانیوں اور بیانات سے یوں وابستہ ہوگئے ہیں کہ انھیں ان کے سیاق سے الگ کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہو جاتا ہے۔ان کے یہ قول زندگی کی کسی حقیقت یا حکمت کے پروردہ ہوتے ہیں۔ نیز مزاح کی آمیزش بھی انھیں اہم بنا دیتی ہے۔ دانش مندی اور ہنر مندی سے آراستہ یوسفی کے ان اقوال زریں کی تعریف وتوصیف ہر خاص و عام نے کی ہے۔اقوال سازی میں انہوں نے صنعت کاری سے بھی کام لیا ہے اور ذہانت سے بھی نیز متضاد الفاظ اور مضحک صورتِ حال سے بھی فیض اٹھایا ہے اور لفظی و معنوی صنعتوں کے استعمال نے ان میں گہرائی و گیرائی کے ساتھ ساتھ جاذبیت بھی پیدا کر دی ہے۔صنعتِ تضاد،صنعتِ تجنیس و تلمیح اور رعایتِ لفظی،قولِ محال اور تمثیل وغیرہ نے ان اقوال میں تازگی و شگفتگی پیدا کر دی ہے۔یوسفی کے یہ اقوال ان کی چاروں کتابوں کی زینت بنے ہیں۔اقوال سازی کا یہ سلسلہ ان کی دو آخری کتابوں (زرگزشت،آبِ گم) میں تیز سے تیز تر ہو جاتا ہے۔ یوسفی کے یہ اقوال زندگی،معاشرہ اور فرد و سماج کی نقاب کشائی بھی کرتے ہیں،نفسیاتی مطالعہ بھی کرتے ہیں اور ہنسی ہنسی میں پتے کی بات کہنے کی صلاحیت بھی ان میں موجود ہے۔

مشتاق احمد یوسفی کی اگلی کتاب کے انتظار کے دوران میں نے طے کیا کہ ان اقوال کا ایک مجموعہ ترتیب دے کر انھیں خراج عقیدت پیش کیا جائے۔قارئین چاہیں تو اسے ان کی پانچویں کتاب بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ تمام اقوال ان ہی کے جادو رقم قلم کے مرہون منت ہیں۔ میں نے قارئین کی آسانی کے لیے مختلف عنوانات کے تحت انھیں ترتیب دیا ہے۔ ہر قول کے آخر میں کتاب کا نام بھی مندرج ہے۔طنز و مزاح،ادب،عورت،ناسٹلجیا،جانور،کراچی اور متفرقات کے عنوان سے ان اقوال کو ترتیب دیا گیا ہے۔امید ہے کہ میری اس ادنیٰ کاوش کی پذیرائی ہوگی۔

آبِ گم کے بعد مشتاق احمد یوسفی کے چند مضامین مختلف رسائل میں شائع ہوئے۔اس سلسلے کے تین مضامین میرے پاس موجود تھے۔ چنانچہ بطور تبرک انھیں بھی شامل اشاعت کیا جا رہا ہے۔ ''چادر، چاند بی بی اور کالم بھر چاندی'' کے عنوان سے بشریٰ رحمٰن کے فکر و فن کا محاکمہ کیا ہے جبکہ

دوسرے مضمون بعنوان ''شاہ جی کی کہانی، دوسرے، شاہ جی کی زبانی'' میں شفیع عقیل کی کتابوں کے تقریبِ اجرا میں پڑھا گیا، یہ جلسہ مارچ ۲۰۰۰ء میں کراچی میں منعقد کیا گیا تھا۔ تیسرا مضمون ایک تقریب پُر سعید کا خطبۂ صدارت ہے۔ جس کا سنِ اشاعت ۲۰۰۲ء ہے۔ قارئین کی دلچسپی کے لئے طارق حبیب کا مضمون ''مشتاق احمد یوسفی کی شخصی اور ادبی زندگی'' بھی شائع کیا جارہا ہے۔ تاکہ ان کے سوانحی کوائف پر طائرانہ نظر ڈالی جاسکے۔

مجھے امید ہے کہ میری اس کاوش کو عاشقانِ یوسفی پسند فرمائیں گے۔ مشتاق احمد یوسفی اپنی عمر کی دسویں دہائی میں ہیں۔ مگر اُمید ہے کہ تصنیف وتالیف کا سلسلہ جاری رکھیں گے اور انشاءاللہ جلد ہی ہم ان کی نئی کتاب رکتابوں سے فیض یاب ہوں گے۔ اللہ انھیں صحت کے ساتھ باعمل زندگی عطا فرمائے۔ آمین۔

تمام خیر خواہوں، بزرگوں اور ساتھیوں کو میرا اسلام۔

مظہر احمد

اکتوبر ۲۰۱۴ء

مشتاق احمد یوسفی کی شخصی اور ادبی زندگی

طارق حبیب

یہ اردو زبان و ادب کی خوش قسمتی ہے کہ مشتاق احمد یوسفی جیسا ادیب اور دانشور اُسے میسر آیا۔ تھوڑے بہت اختلاف کے ساتھ ناقدینِ فن کا اِس امر پر اتفاق بھی ہے کہ مشتاق احمد یوسفی اُردو زبان وادب کے بے مثال ادیب ہیں۔ کسی ادیب کی اس سے بڑی خوش قسمتی اور کیا ہوسکتی ہے کہ اُس کا عہد اُسے محبت اور اخلاص سے اپنائے اور اپنا سرمایہ تسلیم کرے (۱)۔

بلا شبہ ادب زندگی کا بہترین نقاد اور محتسب ہے۔ ادب اور زندگی ایک دوسرے کے ساتھ یوں گتھے ہوئے ہیں کہ علیحدہ نہیں کیے جاسکتے، لہٰذا اگر یہ تصور کرلیا جائے کہ کسی فنکار کی زندگی اُس کے فن پر اثر انداز نہیں ہوتی، تو یہ بات جزوی سچائی ہوسکتی ہے، کلی صداقت ہرگز نہیں، کیوں کہ کسی بھی انسان کے نجی حالات براہ راست یا بالواسطہ اُس کے فن پر اثر انداز ہوتے ضرور ہیں، اس لیے بہتر تنقیدی نتائج اخذ کرنے کی خاطر تحقیق کے ثمرات سے استفادہ ہمیشہ سودمند رہا ہے۔

اس پس منظر میں تحقیق وتنقید کے باہمی رشتے سے انکار نہیں کیا جاسکتا، اس لیے کوئی بھی تنقیدی رُجحان یا نظریہ غالب ہو، تحقیق کی اہمیت مسلّم ہے۔ اگر عمرانی تنقید عہد اور سماج سے بے خبری کو اخذِ نتائج میں مزاحم گردانتی ہے، تو نفسیاتی تنقید میں فنکار کے فن کی گرہ کشائی کے لیے حالاتِ زندگی اساسی کلید ہیں۔ تاہم آج کا نقاد ان تمام طریق ہائے تنقید کو علیحدہ علیحدہ خانوں میں بانٹ کر دیکھنے اور پرکھنے کے بجائے انہیں ایک ہی اکائی میں پرو کر سمجھنے اور سمجھانے کا قائل ہے۔

مشتاق احمد یوسفی کی پہلی کتاب ''چراغ تلے'' ۱۹۶۱ء میں شائع ہوئی، دوسری تخلیق ''خاکم بدہن'' ۱۹۷۰ میں سامنے آئی۔ تیسری تصنیف ''زرگزشت'' ۱۹۷۶ء میں اشاعت کے مراحل سے گزری، چوتھا اور تاحال آخری شاہکار ''آبِ گم'' ۱۹۹۰ء میں رونمائی کے لئے پیش کیا گیا۔

''زرگزشت'' مشتاق احمد یوسفی کی زندگی کے اُن پچیس برسوں (۱۹۵۰ء سے ۱۹۷۴ء تک) کا

احاطہ کیے ہوئے ہے، جو اُن کی بینک کی پیشہ وارانہ زندگی (Banking Life) سے متعلق ہیں، مگر ان کی زندگی کے وہ حقائق اور اعداد و شمار (Facts and Figures) یہاں دستیاب نہیں، جو کسی تحقیقی ضرورت کو کامل طور پر پورا کرتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ''زرگزشت'' میں مشتاق احمد یوسفی نے اپنے حالات فراہم نہیں کیے۔ یہاں حالات زندگی بھی موجود ہیں اور ان میں کوئی غلط بیانی بھی نہیں کی گئی اور صرف 'زرگزشت'' ہی پر کیا موقوف' مشتاق احمد یوسفی نے اپنے حالات، زندگی اور اپنے متعلق کئی اہم اشارے اپنی چاروں تصانیف ('چراغ تلے'، 'خاکم بدہن'، 'زرگزشت' اور 'آب گم') میں مہیا کر دیے ہیں۔ ضرورت صرف انہیں دریافت کرنے اور سمجھنے کی ہے۔ راقم ۱۹۹۵ء میں مذکورہ بالا چاروں کتابوں سے مشتاق احمد یوسفی کا خود نوشت سوانحی خاکہ مرتب کرنے کی بھی ایک کوشش کر چکا ہے۔ مگر بات پھر وہی ہے کہ یہاں ہر بات اور ہر حقیقت رمز کے پیرائے میں بیان کی گئی ہے، جس کی شرح اور تفہیم کا کام انہوں نے قارئین پر چھوڑ دیا ہے اور یہ بھی درست ہے کہ 'زرگزشت' محض ذاتی کوائف نامہ 'معمولی سرگزشت یا روایتی سوانح عمری نہیں ہے، اس کے کئی ایک دوسرے مقاصد و مطالب بھی ہیں۔ یہ مزاح میں ملبوس ایک اہم ادبی دستاویز بھی ہے، فلسفۂ حیات بھی ہے اور زندگی کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کے کچھ نازک اور حساس پہلوؤں کی راز دار اور امین بھی ہے۔

مشتاق احمد یوسفی کا آبائی وطن جے پور، ضلع ٹونک، راجستھان، بھارت ہے۔ وہ وہاں کے مقامی (Native) مسلمان تھے۔ اُن کے باپ دادا جے پور میں نسلوں اور پشتوں سے آباد تھے۔

راجستھان (۲) بھارت کے شمال مغرب میں واقع ایک ریاست ہے۔ یہاں راجپوت اور راٹھور رہتے تھے۔ اسی باعث یہ 'راجپوتانہ' بھی معروف ہے۔ راجپوتوں کی راج دھانی، راجستھان کا وجود کم و بیش ایک ہزار سال پرانا ہے۔ راجپوتوں کے بعد یہ مغل اور مراٹھا حکومتوں کے زیر نگیں رہا، پھر حکومتِ برطانیہ غالب رہی اور ہندوستان کی تقسیم کے بعد راجستھان کلی طور پر بھارت کا حصہ بن گیا، جو اس وقت بائیس ریاستوں پر مشتمل ہے۔ راجستھان اناج، صنعت، علم و ادب اور فنون لطیفہ کے لحاظ سے بھارت کا ایک زرخیز علاقہ ہے۔ (۳) راجستھان میں انڈو آرین زبان بولی جاتی تھی۔ اس کے چار بڑے لہجے ہیں۔ شمال مغربی میواتی، جنوبی مالوی، مغربی مارواڑی اور مشرقی جے پوری۔ ان میں مقبول عام اور اہم ''مارواڑی'' ہی ہے۔ سرکاری زبان ہندی ہے۔ (۴)

'ٹونک' چھ اضلاع پر مشتمل ایک ریاست تھی جو، راجپوتانے اور وسط ہند کے درمیان واقع تھی۔ٹونک، علی گڑھ اور نیبا ہڑ ھ راجپوتانے میں اور باقی تین اضلاع چھپڑہ، پڑاوہ اور سرونج وسط ہند میں آتے تھے۔ٹونک (۵)۔ ریاست ہی کے ایک ضلع کا نام بھی ہے۔شروع کار میں اسے رسیا کی ٹیکری کہا جاتا رہا، پھر،ٹونکوا، پکارا جانے لگا، جو آخر کار ٹونک پر منتج ہوا۔اسلامی حکومت کے قیام کے دوران میں اس کا نام، محمد آباد بھی رکھا گیا۔ٹونک بھی راجستھان میں شامل ہے۔یہ ساری ریاست زیادہ تر ہندو مذہب کی حامل ہے۔(۶)

مشتاق احمد یوسفی اندرون سانگانیری گیٹ، جے پور میں رہتے تھے۔یہ اُن کا آبائی مسکن ہے۔اُن کی پیدائش ٹونک میں ہوئی، پھر آٹھ سال کی عمر میں واپس جے پور آگئے، مادری زبان مارواڑی ہے۔ددھیال سے یوسف زئی پٹھان اور ننھیال سے راجپوت (راٹھور) ہیں۔غور کیجئے کہ اردو، ان کی مادری زبان نہیں ہے، لیکن کمال لگن، شبانہ روز محنت اور عطائے رب کریم سے زبان اُردو میں جو مقام انہیں حاصل ہوا، وہ اہل زبان کو بھی بعض اوقات کم ہی نصیب ہوتا ہے۔

مشتاق احمد یوسفی کے دادا کا نام ''ملنگ خان'' تھا، جو اپنے والد کی ادھیڑ عمری میں کسی ملنگ کی دعا سے پیدا ہوئے۔ملنگ خان مہاراجہ ہائی سکول جے پور سے میٹرک اور مہاراجہ کالج جے پور راجپوتانہ بورڈ سے انٹرمیڈیٹ تک تعلیم حاصل کر کے پوسٹ ماسٹر کے طور پر ملازم ہوگئے اور ملازمت کے سلسلہ میں ناگ پور، آگرہ، اجمیر شریف اور جے پور میں رہے۔

مشتاق احمد یوسفی کی دادی کا نام ''نوربی بی'' تھا جو'الور' کی رہنے والی تھیں۔نور بی بی کے بطن سے ''عبدالکریم خان یوسفی'' پیدا ہوئے، جو مشتاق احمد یوسفی کے والد ہیں۔(۷)

مشتاق احمد یوسفی کے نانا احمد بخش، مسلمان راٹھور اور اجمیر شریف کے قریب 'بیاور' کے رہنے والے تھے اور ان کی نانی 'جاورے' کی تھیں۔احمد بخش راٹھور انسپکٹر آف پولیس کے عہدے سے سبک دوش ہوئے تھے۔عمائدین شہر میں انہیں گنا جاتا تھا۔خان بہادر یا'خان صاحب، کا خطاب بھی انہیں میسر آیا۔روایات کے مطابق وہ بہت دین دار انسان تھے۔مشتاق احمد یوسفی بتاتے ہیں کہ اردو خط کی مشق ان کے نانا نے ہی انہیں کرائی۔ان کے نانا نانی کے ایک بیٹا اور چار بیٹیاں ہوئیں۔مشتاق احمد یوسفی کی والدہ کا نام مسعود جہاں اور ان کے ماموں کا نام عبدالعزیز تھا۔ماموں اور تینوں خالاؤں کا انتقال ہو چکا ہے۔ماموں اور ایک خالہ کا انتقال کراچی میں، جبکہ دو خالاؤں کا انتقال ہندوستان میں ہوا۔(۸)

مشتاق احمد یوسفی کے والد کا نام عبدالکریم خان یوسفی ہے۔عبدالکریم خان یوسفی نے مہاراجہ ہائی اسکول جے پور سے میٹرک، مہاراجہ کالج جے پور (راجپوتانہ بورڈ) سے انٹرمیڈیٹ اور مہاراجہ کالج جے پور (آگرہ یونی ورسٹی) سے ۱۹۱۴ء میں بی اے کیا اور یہ بات بہت اہم ہے کہ وہ جے پور کے پہلے مقامی مسلمان تھے، جنھوں نے بی اے کیا۔مختلف مصاحبوں (Interviews) اور زیرِ گزشت کے تفصیلی مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ عبدالکریم خان یوسفی ایک پابند شرع اور راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔لفظ 'یوسفی' کی وضاحت کرتے ہوئے مشتاق احمد یوسفی نے بتایا کہ:

"۱۹۲۸ء/ ۱۹۲۹ء/ ۱۹۳۰ء میں سے کسی سال میرے والد پشاور گئے۔ وہاں انہوں نے اپنے آپ کو پٹھان یوسف زئی کہا، تو ان کا مذاق اڑایا گیا کہ آپ کیسے پٹھان لوگ ہیں، اس لئے کہ یہ تو صدیوں سے جے پور میں آباد تھے۔وہ جب واپس آئے، تو انہوں نے اپنے آپ کو یوسف زئی کہنا چھوڑ دیا اور اس کی جگہ 'یوسفی' کہنے لگے اور میں نے 'خان' بھی Drop کر دیا۔" (۹)

عبدالکریم خان یوسفی شروع میں اسکول ٹیچر رہے۔۱۹۱۵ء سے ۱۹۳۱ء، تک ٹونک میں پولیٹیکل سیکریٹری، یعنی انگریز ریذیڈنٹ اور نواب کے درمیان رابطے کا ذریعہ رہے۔۱۹۳۱ء میں واپس جے پور آ گئے اور کچھ عرصہ بیکار رہے۔پھر مختلف کاروبار کیے۔اس زمانے میں امپیریل ٹوبیکو کمپنی سگریٹ کی واحد کمپنی تھی، جو انگریزوں کی ملکیت تھی۔کچھ عرصہ اس کمپنی کی ایجنسی بھی ان کے پاس رہی، پھر ٹھیکیداری کرتے رہے۔آخر کار عبدالکریم خان یوسفی سیاست کے میدان میں اُترے۔وہ سینٹ مسلم لیگ کے صدر حزبِ اختلاف آسمبلی کے لیڈر اور قانون ساز آسمبلی (LagislativeAssembly) کے ڈپٹی سیکریٹری رہے۔جے پور میونسپلٹی کے دو مرتبہ میئر (Mayor) بھی رہے۔پھر سیاسی وجوہات کی بنا پر انہیں جے پور (بھارت) چھوڑنا پڑا۔سقوطِ حیدر آباد کے موقع پر اپنی حق گوئی کے باعث پاکستان اور مسلمانوں کے موقف کی بھرپور حمایت کے صلے میں انہیں ہجرت کرنا پڑی۔ (۱۰)

"وہ بہت صاف گو انسان تھے، سچ کہنے سے ذرا نہیں ہچکچاتے تھے۔ تو Legistative Assembly کے ایک اجلاس کی صدارت کر رہے تھے۔ یہ وہ دن تھا جب حیدر آباد پر حملہ ہوا تھا اور قائد اعظم کی وفات کا بھی یعنی ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء، کا دن تھا، تو

وہاں کسی کانگریسی ممبر نے یہ Resolution پیش کیا کہ حیدرآباد فتح ہوگیا ہے، اس کی خوشی میں چھٹی ہوجانی چاہیے، تو میرے والد جو Session کی صدارت کر رہے تھے، انھوں نے یہ Ruling دی کہ چھٹی کا کوئی جواز نہیں بنتا، اس لئے کہ آج اگر آپ اس خوشی میں چھٹی کرتے ہیں کہ حیدرآباد فتح ہوگیا ہے، تو کل جب پاکستان، کشمیر فتح کر لے گا، تو آپ کتنے دن سوگ میں بند رہیں گے۔ تو یہ سننا تھا کہ اودھم مچ گیا۔ لوگوں نے انہیں پھر یہ مشورہ دیا کہ آپ یہاں سے چلے جائیں۔ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ وہاں سے چلے آئیں۔ (۱۱)

یوں عبدالکریم خان یوسفی اس واقعے کے بعد ستمبر ۱۹۴۸ء ہی میں جے پور سے ہجرت کر کے حیدرآباد (پاکستان) آ گئے۔ یہاں انہوں نے کوئی ملازمت یا کاروبار نہیں کیا۔ ۲۶ جون ۱۹۵۰ء کو بہ حالتِ روزہ، جب وہ حیدرآباد سے ٹنڈو آدم گئے ہوئے تھے، ان پر دل کا دورہ پڑا اور خالق حقیقی سے جا ملے اور حیدرآباد کے پھلیلی قبرستان میں ۲۷ جون ۱۹۵۰ء کو سپرد خاک ہوئے۔ مشتاق احمد یوسفی کی والدہ جو دمے (Asthma) کے عارضے میں مبتلا تھیں ۱۹۷۱ء میں حرکت قلب بند ہوجانے سے وفات پا گئیں۔

بیسویں صدی عیسوی کی تیسری دہائی کے آغاز میں عبدالکریم خان یوسفی اور مسعود جہاں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئے۔ (۱۲) اللہ تعالیٰ نے انہیں دو بیٹے اور دو بیٹیاں عطا کیں۔ چاروں کے نام شوکت آرا، مشتاق احمد خان یوسفی، فردوس جہاں اور ادریس احمد خان یوسفی ہیں۔

سرکاری کاغذات کے مطابق مشتاق احمد یوسفی ۴ راگست ۱۹۲۳ء کو ٹونک، راجستھان میں پیدا ہوئے۔ یہی تاریخ ان کے میٹرک کی سند میں بھی درج ہے۔ یہی تاریخ زکریا یونیورسٹی ملتان، میں لکھے جانے والے ایم اے (اردو) کے مقالے میں بھی درج ہے۔ (۱۳) تاہم یہ بات اتنی آسان نہیں ہے۔ مشتاق احمد یوسفی کی تاریخ پیدائش کا معاملہ اہم اور پیچیدہ ہے۔ اپنی سوانح عمری 'زرگزشت' میں بھی جہاں انہوں نے اپنے حالات زندگی کا مفصل ذکر نہیں کیا، وہاں انٹرویوز میں بھی اس اہم معاملے کو صیغۂ راز میں رکھ چھوڑا ہے لیکن ان کی اصل تاریخ پیدائش کچھ اور ہے۔ انہوں نے انٹرویو کے دوران میں خود بتایا کہ:

"Official تاریخ پیدائش ۴ راگست ۱۹۲۳ء ہے۔ اصل تاریخ پیدائش اور ہے، جس کو میں اس لئے نہیں بتاتا کہ اس سے میری ملازمت، میری پنشن وغیرہ

سب Effect ہوتی ہیں۔ تھوڑا بہت فرق جیسا پہلے زمانے میں ہوتا تھا، وہ ہے۔ یہ تھوڑا سا فرق ہے، جو میں نہیں بتاؤں گا۔'' (۱۴)

اسی طرح ایک اور انٹرویو میں کہتے ہیں:

''میں آپ کو پیدائش کا سال نہیں بتاؤں گا، کیونکہ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔'' (۱۵)

''چراغ تلے'' جو ان کی ادبی زندگی کا پہلا باقاعدہ نقش ہے، میں لکھتے ہیں:

''کیا تاریخ پیدائش وہی ہے؟ جو میٹرک کے سرٹیفکیٹ میں درج ہے۔'' (۱۶)

بڑا اہم اور دل چسپ پہلو ہے کہ مشتاق احمد یوسفی اپنی اصل تاریخ پیدائش بتانے سے گریزاں ہیں اور اس سے بھی دل چسپ یہ امر کہ اپنی تاریخ پیدائش کے مسئلے کو موضوع بحث (اور موضوع فن) بنا رکھا ہے۔ وہ چاہتے تو اس حقیقت کی طرف اشارہ ہی نہ کرتے۔ مگر انہوں نے اس کا برملا اظہار کیا ہے کہ حقیقی تاریخ پیدائش کچھ اور ہے، جس کے اظہار سے ان کے کئی ایک معاملات متاثر ہوتے ہیں۔

اُصول تحقیق میں مفروضے (Hypothesis) کی بڑی اہمیت ہے، اس لیے ہم نے کچھ مفروضات کو ہوا دی ہے، مثلاً ممکن ہے کہ یہ سارا جھگڑا محض بحث برائے بحث اور ان کے شگفتہ انداز تحریر وتقریر کا کوئی کرشمہ ہو۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ خود بھی اپنی اصل تاریخ پیدائش سے اتنے ہی ناواقف ہوں، جتنے کہ ہمارے سمیت دوسرے ناقدین ومحققین اور قارئین ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس اخفا کی وجہ وہ خفگی ہو، جس کا اظہار 'زرگزشت' میں یوں ہوا ہے:

''خاندان، تاریخ اور جائے ولادت کے انتخاب میں میرا ووٹ نہیں لیا گیا۔'' (۱۷)

خیر یہ سب کچھ تو یونہی دھیان میں آ گیا، اب ہم اصل معاملے کی طرف پیش قلمی کرتے ہیں۔ زرگزشت جو مشتاق احمد یوسفی کی سوانح عمری ہے اس کے متعلق بتاتے ہیں:

''زرگزشت'' میں کوئی غلط بیانی نہیں کی گئی۔'' (۱۸)

اس بیان کی روشنی میں ہمیں زرگزشت کے ان جملوں پر غور کرنا چاہئے:

''مثلاً یہی کہ کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

''یکم محرم کو، ستوانسا، ٹونک (راجستھان) میں۔'' (۱۹)

''زرگزشت'' کی صداقت کے پیش نظر'' یکم محرم الحرام'' کو حقیقی تاریخ مان لینے میں کوئی عذر نہیں۔ اب اگر' یکم محرم الحرام' کو بنیاد بنا کر' تقویم ہجری وعیسوی' (۲۰) میں دونوں تاریخوں کا مقابلہ کیا جائے تو' ۱۹۲۳ءعیسوی، کے مقابل، جو ہجری سال سامنے آتا ہے، وہ' ۱۳۴۲ ہجری، بنتا ہے اور یکم محرم الحرام ۱۳۴۲ ہجری ۴ راگست ۱۹۲۳ء کے بجائے ۱۴ راگست ۱۹۲۳ کی تاریخ سامنے آتی ہے۔ اس طرح دونوں تاریخوں کا موازنہ کرنے سے دس دنوں کا فرق نکلتا ہے بشرطیکہ یہ یکم محرم الحرام ۱۳۴۲ ہجری ہی ہو، جو ۱۹۲۳ء کو فرض کر کے طے کیا گیا ہے۔

'تقویم ہجری وعیسوی، کے علاوہ جوہر تقویم سے استفادہ کرتے ہوئے بھی یہی تاریخ موصول ہوتی ہے۔ 'جوہر تقویم' میں دیئے گئے جدول کے مطابق ۱۹ محرم الحرام ۱۳۴۲ ہجری کے مقابل یکم ستمبر ۱۹۲۳ء کی تاریخ درج ہے اور اس میں سے اٹھارہ دن نکال کر یکم محرم الحرام ۱۳۴۲ ہجری کی تاریخ کا تقابل کرنے سے ۱۴ راگست ۱۹۲۳ء ہی کی تاریخ برآمد ہوتی ہے۔ (۲۱) تاہم یہ تاریخ بھی حرف آخر نہیں البتہ اس کے درست ہونے کا امکان بہر حال موجود ہے۔ امکانی سطح پر اگر یکم محرم الحرام کو بنیاد بنا کر تین تاریخوں کا تعین کیا جائے تو کچھ یوں نتیجہ وصول پائے گا:

۱۔ یکم محرم الحرام ۱۳۴۱ھ بہ مطابق ۲۴ راگست ۱۹۲۲ء
۲۔ یکم محرم الحرام ۱۳۴۲ھ بہ مطابق ۱۴ راگست ۱۹۲۳ء
۳۔ یکم محرم الحرام ۱۳۴۳ھ بہ مطابق ۲ راگست ۱۹۲۴ء

معتدل اور محتاط اندازے کے مطابق درمیانی تاریخ یعنی'' یکم محرم الحرام ۱۳۴۲ ہجری سہ شنبہ بہ مطابق ۱۴ راگست ۱۹۲۳ عیسوی بروز منگل کے درست ہونے کا زیادہ امکان ہے، یہ اس لیے کہ ہمارا دین بھی درمیانے راستے کو اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہے۔

اب ایک اور دل چسپ تحقیقی صورت حال ملاحظہ ہو۔ درج بالا ساری جدوجہد کے بعد جو تاریخ ہم نے دریافت کرنے کی کوشش کی، اس کا اندراج تو اوری اینٹل کالج پنجاب یونی ورسٹی لاہور میں رشید احمد صدیقی اور مشتاق احمد یوسفی کے تقابلی مطالعے پر مبنی ایک مقالے (۱۹۹۰ء) میں فخر النساء نے پہلے ہی سے کر دیا ہے۔ (۲۲) بعینہٖ بہاء الدین زکریا یونی ورسٹی ملتان میں آب گم پر لکھے جانے والے ایک مقالے (۱۹۹۲) میں طارق رشید نے بھی یہی تاریخ درج کی ہے:

''تاریخ پیدائش ۱۴ راگست ۱۹۲۳ء ہے'' (۲۳)

حقیقت یہ ہے کہ درج بالا دونوں محققین نے مشتاق احمد یوسفی کی تاریخ پیدائش بہاء الدین زکریا یونی ورسٹی ملتان کے تحت ۱۹۸۴ء میں محمد اصغر کے لکھے ہوئے مقالے (۲۴) سے لی ہے، جہاں اصلاً ۴راگست درج ہے، مگر بعد میں آنے والوں نے غلطی سے ۴ راگست کو ۱۴راگست سمجھ لیا، کیوں کہ اگر یہ تاریخ غلطی سے درج نہ ہوئی ہوتی، تو اس کے ساتھ کوئی سند یا کوئی اختلافی بحث، یا کسی قسم کی تحقیقی وضاحت ضرور موجود ہوتی، جیسا کہ ہم نے درج بالا صفحات میں اپنی سی کوشش کی ہے، تاہم دونوں مقالہ نگاروں نے تحقیق، تصدیق اور توجہ کیے بغیر ۴ کو ۱۴، بنا دیا کہ یہ تینوں تحقیقی و تنقیدی مقالہ جات ایم اے (اردو) کی سطح پر قلم بند کیے گئے ہیں۔

اور تو اور یہی تاریخی غلطی ۲۰۰۵ء میں یونیورسٹی آف سرگودھا کے تحت ایم اے اردو کی سطح پر لکھے جانے والے ایک مقالے میں ثمرہ اکرم نے بھی کی ہے، جب کہ ۲۰۰۳ء میں شائع ہونے والی ہماری کتاب 'یوسفیات' بھی ان کے پیش نظر تھی۔ انہوں نے شاید مشتاق احمد یوسفی کے اپنے بیان سے زیادہ ہمارے مفروضے کو اہم خیال کیا ہے اور اگر ایسا ہی ہے، تو بھی اس پر کسی قسم کا کوئی حاشیہ نہیں دیا گیا، محض ۱۴راگست ۱۹۲۳ء کی تاریخ درج کر دی گئی ہے۔ (۲۵)

اگر چہ مشتاق احمد یوسفی کا آبائی وطن 'جے پور' اور جائے پیدائش قطعی طور پر 'ٹونک' ہے مگر تاریخ پیدائش کی طرح ان کی جائے پیدائش، میں بھی ایک بات کی وضاحت ضروری ہے۔ 'خاکم بدہن' کے مقدمے میں شان الحق حقی سے مکالمہ کرتے ہوئے مشتاق احمد یوسفی لکھتے ہیں:

> ''چہک کر بولے: ہاں! قصور پر یاد آیا۔ آپ نے ایک جگہ فوتیدگی لکھا ہے۔ یہ مارواڑیوں کی دیسی اردو آپ نے کہاں سے سیکھی؟ عرض کیا مارواڑ میں، جہاں ہم پیدا ہوئے۔ ہمیں کارتے اتار کرفٹ پاتھ پر گلے لگاتے ہوئے بولے۔ تو گویا اردو آپ کی مادری زبان نہیں ہے۔'' (۲۶)

ایک جگہ وہ 'مارواڑ' میں اپنی پیدائش سے آگاہ کرتے ہیں اور دوسری جگہ 'ٹونک' میں۔ یہ بھی درست ہے کہ سوانحی حیثیت سے 'زرگزشت' کی اہمیت بقیہ ہر کتاب سے زیادہ ہے' دراصل مارواڑ کا ذکر خاکم بدہن کے مقدمے میں ہوا ہے اور تحقیقی نقطۂ نظر سے مصنف کے خود نوشت مقدمے کو بنیادی ماخذ اور سند مانا جاتا ہے۔ یہ ساری بحث یوسفی صاحب سے کی گئی، تو انہوں نے بتایا کہ مارواڑ کا ذکر انہوں نے جائے پیدائش کے بجائے، مادری زبان کے اعتبار سے کیا ہے، کیوں کہ اس وقت پورے

راجستھان کی مقبول زبان مارواڑی ہی تھی اور پھر قطعی طور پر کہا:

''ہم راجستھان کی مسلم ریاست''ٹونک''میں پیدا ہوئے۔''(۲۷)

اس بحث کا مقصد مشتاق احمد یوسفی پر گرفت کرنا ہرگز نہیں اور نہ ہماری ایسی مجال ہے، یہ وضاحت محض تحقیقی طور پر خود اشتباہ سے بچنے اور دیگر قارئین و محققین کو کسی تشویش سے بچانے کی خاطر کی گئی ہے، اس لیے کہ جغرافیائی سطح پر ٹونک اور مارواڑ بہر حال دو علیحدہ علیحدہ مقامات ہیں۔ البتہ اکثر قارئین راجستھان، ٹونک اور جے پور کی طرح ''ست وانسا'' کو بھی اسم مکان خیال کرتے ہیں، جو کہ بڑی غلط فہمی ہے۔ ست وانسا اسم مکان نہیں، اسم صفت ہے۔ دراصل مشتاق احمد یوسفی کی پیدائش سات ماہ کے بعد ہوئی، یعنی وہ ست ماہایا ستوانسا (۲۸) ہیں ان کے اپنے بقول:

''میں ایک Premature baby ہوں، سات مہینے ہی میں پیدا ہو گیا۔(۲۹)

زندگی کے پہلے آٹھ سال مشتاق احمد یوسفی نے ٹونک ہی میں بسر کیے، وہیں سے اپنی تعلیم کا آغاز کیا اور تیسری جماعت تک ٹونک ہی میں زیرِ تعلیم رہے۔ پھر ۱۹۳۱ء میں اپنے آبائی شہر جے پور واپس آگئے۔ مہاراجہ ہائی سکول جے پور سے انہوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ حساب، فارسی اور ڈرائنگ میں کمزوری یا عدم دل چسپی کی بنیاد پر اُنہیں میٹرک میں سیکنڈ کلاس میسر آئی لیکن میٹرک کے بعد مہاراجہ کالج جے پور (راجپوتانہ بورڈ) سے انٹرمیڈیٹ میں فسٹ کلاس فسٹ رہے اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔ راجپوتانہ بورڈ سے انٹرمیڈیٹ میں اوّل پوزیشن پر گولڈ میڈل حاصل کرنے والے وہ پہلے مسلمان ہیں۔

انٹرمیڈیٹ میں انہوں نے انگریزی ادب، تاریخ، فلسفہ اور اردو جب کہ بی اے میں انگریزی ادب، فلسفہ اور تاریخ کے مضامین پڑھے اور مہاراجہ کالج جے پور (آگرہ یونیورسٹی) سے ۱۹۴۳ء میں بی اے میں اول پوزیشن اور انگریزی ادب میں ریکارڈ قائم کرنے پر کرنل اوگاوی گولڈ میڈل، حاصل کیا۔ یہ میڈل اور پوزیشن حاصل کرنے والے بھی وہ پہلے مسلمان گریجویٹ (Graduate) ہیں۔ ان حقائق کی روشنی میں ایک بڑی دل چسپ اور قابل رشک بات منظر عام پر آتی ہے کہ ملنگ خان، عبدالکریم خان یوسفی اور مشتاق احمد یوسفی (یعنی دادا، بیٹا اور پوتا) نے ایک ہی اسکول (مہاراجہ ہائی سکول جے پور) سے میٹرک اور ایک ہی کالج اور تعلیمی بورڈ (مہاراجہ کالج جے پور اور راجپوتانہ بورڈ) سے انٹرمیڈیٹ کیا، نیز مشتاق احمد یوسفی اور ان کے والد نے ایک ہی کالج (مہاراجہ کالج جے پور،

آگرہ یونیورسٹی) سے بی اے کیا۔

۱۹۴۵ء میں مشتاق احمد یوسفی نے مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ سے فلسفہ میں ایم اے کیا اور فسٹ کلاس فسٹ رہے۔ لیکن اول پوزیشن کے باوجود گولڈ میڈل نہ ملا۔ اسی عرصے میں علی گڑھ یونی ورسٹی سے فسٹ کلاس میں ایل ایل بی کی ڈگری بھی حاصل کی، البتہ کوئی پوزیشن حاصل نہ ہوئی (۳۰) یہ شاید فلسفہ میں ایم اے تک تعلیم حاصل کرنے کا اثر ہو کہ ایک وقت ایسا بھی آیا جب وہ مذہب کے بالکل قائل نہ رہے (۳۱) مگر جلد ہی اس طرف لوٹ آئے۔ دراصل آگاہی کی منازل طے کرتے ہوئے راستے میں تشکیک کے پڑاؤ بھی آتے ہیں اور اگر انسان میں ذرا بھی ضبط اور ظرف ہو، تو یہی تشکیک اُس کی تشکیل اور تکمیل کیا کرتی ہے (۳۲)

دینوی تعلیم کے علاوہ انہوں نے قرآن پاک اپنے والد گرامی سے بارہ تیرہ سال کی عمر تک (ناظرہ) پڑھا اور قصص الانبیاء والد ہی سے مکمل سنی۔ اس کے علاوہ ۷۵-۱۹۷۴ میں ایک شامی اور ایک مصری استاد سے عربی بھی سیکھتے رہے۔ ایم اے فلسفہ اور ایل ایل بی تک تعلیم مکمل کرنے کے اگلے ہی برس یعنی ۱۹۴۶ء میں مشتاق احمد یوسفی نے انڈین آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس سروس شپ آل انڈیا' کا امتحان پاس کیا، لیکن انہیں یہ ملازمت اس لیے میسر نہ آئی کہ ان کی نظر (Eye Sight) بہت زیادہ کمزور (منفی سات) تھی۔ اس حوالے سے انہوں نے پورے نظام (System) پر بالعموم اور مذکورہ بالا سلیکشن کمیٹی پر بالخصوص بڑی لطیف طنز اور نکتہ چینی کی ہے کہ:

''میری کوئی سفارش نہیں تھی، حالانکہ بہتوں کی آنکھیں کمزور ہوتی ہیں۔'' (۳۳)

بعد ازاں وہ پروونشل سول سروس' میں آ گئے جب کہ ان کی والدہ کچھ اور چاہتی تھیں:

''والدہ کی بڑی خواہش تھی کہ میں ڈاکٹر بنوں اور عرب جا کر بدوؤں کا مفت علاج کروں۔'' (۳۴)

دراصل قدرت مشتاق احمد یوسفی سے اس سے بھی بڑا کام لینا چاہتی تھی، اس لیے والدہ کی خواہش کے باوجود میڈیکل ڈاکٹر نہ بنے، بلکہ دنیائے ادب کے معالج بنے اور عرب کے بدوؤں کے بجائے ادب کے بدوؤں کا مفت نفسیاتی علاج کرنے لگے۔

۱۹۴۶ء میں مشتاق احمد یوسفی 'پروونشل سول سروس (PCS) میں آئے اور دسمبر ۱۹۴۹ء تک ڈپٹی کمشنر اور ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر رہے۔ ستمبر ۱۹۴۸ء میں ان کے والد، والدہ، بھائی اور بہن ہجرت کر

کے حیدر آباد (پاکستان) چلے آئے۔ یکم جنوری ۱۹۵۰ء کو مشتاق احمد یوسفی خود بھی یہ عہدے، یہ منصب اور یہ اعزازات چھوڑ چھاڑ کر (کراچی) پاکستان آ گئے۔ ان کی بیوی اور ایک بچہ مارچ ۱۹۵۰ء میں کراچی پہنچے۔ اپنی ہجرت کے متعلق بتاتے ہیں:

''پاکستان میں اس بنا پر آیا کہ جون ۱۹۴۹ء میں انہوں نے یہ طے کیا کہ اردو اب سرکاری زبان نہیں رہے گی۔ اس وقت تک اردو سرکاری زبان تھی اور تمام کام اردو ہی میں ہوتا تھا۔ اس کے بعد پھر ہم نے رخصت لی اور یہاں آ گئے۔'' (۳۵)

اس ایک امر سے مشتاق احمد یوسفی کی شخصیت اور کردار کے کئی رخ متعین ہوتے ہیں اور ان کی شخصیت کی تفہیم کے لئے یہ پہلو کسی بھی اعتبار سے نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے۔

مشتاق احمد یوسفی نے جنوری ۱۹۵۰ء میں پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھا اور کراچی شہر کو اپنا مستقر قرار دیتے ہوئے بینکاری کے شعبے سے اپنے درخشندہ و تابندہ مستقبل کا آغاز کیا۔

'معماران پاکستان' اور قائداعظمؒ کے اہم احباب میں ایک نام ایم اے اصفہانی کا بھی ہے، جو ایک غیر سرکاری ہوائی کمپنی Orient Air Ways کے مالک اور مسلم کمرشل بینک لمیٹڈ، کے چیئرمین تھے، کسی خاص توسط سے مشتاق احمد یوسفی کا ان سے رابطہ ہوا اور اصفہانی صاحب نے ان کا تقرر ''اورینٹ ایئرویز'' میں کر دیا۔ اسی دوران میں اس کمپنی کا ایک جہاز گر کر تباہ ہو گیا، جس کے باعث یوسفی صاحب نے یہ ملازمت اختیار نہ کی، مگر پھر مسٹر ایم اے اصفہانی ہی کے ذریعے سے وہ بینک کی ملازمت میں آ گئے (۳۶) اور چالیس برس تک بینکاری کے شعبے سے وابستہ رہے۔ پاکستانی بینکاری کے شعبے کو مستحکم کرنے اور اسے بام عروج تک لانے میں ان کی خدمات قابل قدر ہیں۔ یاد رہے کہ پاکستانی بینکنگ کے ارتقاء میں مشتاق احمد یوسفی کی خدمات اس قدر اہم ہیں کہ اس حوالے سے ایک علیحدہ تحقیقی مقالے کے ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

مشتاق احمد یوسفی نے ۲یا ۳ر جنوری ۱۹۵۰ء ''دی مسلم کمرشل بینک لمیٹڈ'' (۳۷) کے جنرل منیجر مسٹر اینڈرسن کو انٹرویو دے کر ۳ر فروری ۱۹۵۰ء کو convenented Officer کی حیثیت سے بینک کی ملازمت اختیار کی۔ ۴ نومبر ۱۹۵۲ء کو Inspector Of Branches مقرر ہوئے۔ ۳ر مارچ ۱۹۵۴ء کو چیف اکاؤنٹینٹ کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ۲۳ر اپریل ۱۹۶۲ء کو مسلم کمرشل بینک لمیٹڈ کے اسسٹنٹ جنرل منیجر اور یکم اپریل ۱۹۶۴ء سے اپریل ۱۹۶۵ء تک ڈپٹی جنرل منیجر کے

عہدے پر تعینات رہے۔ ۱۹۶۵ء سے ۳۱ دسمبر ۱۹۷۴ء تک آسٹریلیشیا بنک لمیٹڈ (جو الائیڈ بینک لمیٹڈ کا پرانا نام ہے) کے مینجنگ ڈائریکٹر مقرر ہوئے جب یکم جنوری ۱۹۷۴ء کو تمام بینک Nationalized ہوئے یعنی قومیا لیے گئے تو مشتاق احمد یوسفی یکم جنوری ۱۹۷۴ء سے ۱۹۷۶ء تک ''یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ'' کے صدر رہے۔ ۷۸۔۱۹۷۷ تک پاکستان بینکنگ کونسل کے چیئر مین رہے۔ جنوری ۱۹۷۹ء تک ڈائریکٹر انوسٹمنٹ کارپوریشن آف پاکستان، ڈائیریکٹر نیشنل انوسٹمنٹ ٹرسٹ، وائس چیئر مین آف کونسل آف دی انسٹی ٹیوٹ آف بینکرزان پاکستان، ڈائریکٹر پاکستان ایگریکلچرل سٹوریج کارپوریشن، وائس چیئر مین آف دی پاکستان بینکس ایسوسی ایشن، چیئر مین امتحان کمیٹی آف دی انسٹی ٹیوٹ آف بینکرزان پاکستان اور چیئر مین ایڈیٹوریل آف بینکرران پاکستان کے اعزازی عہدوں پر بھی رہے اور Fello of the Institute Of Bankers in Pakistan تو ایک مستقل چیز ہے۔ (۳۸)

جنوری ۱۹۷۹ء میں مشتاق احمد یوسفی لندن چلے گئے جہاں وہ ۱۹۷۹ء سے ۱۹۹۰ء تک (Bank of Credit And Commerce International)BCCI" کے ایڈوائزر رہے اور ریٹائر منٹ کے بعد ۵ر دسمبر ۱۹۹۰ کو پاکستان واپس آ گئے یوں یہ گیارہ برس کا زمانہ انہوں نے اپنے ملک سے باہر گزارا (۳۹)

۱۹۹۰ کے بعد سے پیشہ وارانہ مصروفیات تمام ہوئیں۔ ۱۹۹۱ سے کراچی میں فراغت کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ادبی مصروفیات معمولات حیات ہیں۔ علمی و ادبی تقریبات اور مطالعاتی ترغیبات ہی زندگی کا اثاثہ ہیں۔ اب جب کہ مشتاق احمد یوسفی کی سوانحی تفصیلات مکمل ہوگئی ہیں، ایک غلط فہمی کا ازالہ کر لینا چاہئے اردو انسائی کلوپیڈیا (فیروز سنز لاہور) میں یوں لکھا ہے:

> ''مشتاق احمد یوسفی (؟) اردو کے صاحب طرز طنز و مزاح نگار، ستوانسا (ٹونک، راجستھان بھارت) میں پیدا ہوئے۔ آبائی مسکن جے پور علی گڑھ یونیورسٹی سے ایم اے (اکنامکس) کیا۔ ایک غیر ملکی بینک کی دہلی شاخ میں ملازمت کی۔ ۱۹۵۰ء میں کراچی آ گئے اور متعدد ملکی اور غیر ملکی بنکوں سے وابستہ رہے۔ ۱۹۷۴ء میں یونائٹڈ بینک لمیٹڈ کے صدر مقرر ہوئے تصانیف چراغ تلے' خاکم بدہن' اور زرگزشت (آخر الذکر آپ بیتی ہے)(۴۰)

فیروز سنز انسائی کلو پیڈیا کے مرتبین نے غلط فہمی اور ناقص تحقیقی عمل کی بنا پر مشتاق احمد یوسفی کو بینکنگ سے وابستہ ہونے کی بنا پر ایم اے اکنامکس بتایا ہے حالاں کہ وہ ایم اے فلسفہ ہیں۔ انہوں نے بینک کی کسی دہلی شاخ میں ملازمت نہیں کی، بلکہ بھارت میں وہ سول سروس میں رہے اور Banking Life کا آغاز جنوری ۱۹۵۰ میں کراچی (پاکستان) میں مسلم کمرشل بینک لمیٹڈ سے کیا اور یہاں بھی کسی غیر ملکی بینک سے وابستہ نہیں رہے اسی طرح ستو انسا کوئی مقام نہیں صورت حال ہے، پس ثابت ہوا کہ محض اندازوں کی بنیاد پر کھڑی کی گئی تحقیق کی پُر شکوہ عمارت ایک نہ ایک دن ضرور گر پڑتی ہے اور یوں اس کے زیر سایہ بسنے والوں کے بہت سے (جانی اور مالی) نقصان کے اندیشے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

تعلیم سے فراغت اور ملازمت کے حصول کے فوراً بعد ۱۵ر جون ۱۹۴۶ء کو مشتاق احمد یوسفی نے فلسفہ میں ایم اے تک پڑھی لکھی اور اہل زبان خاتون ادریس فاطمہ سے اپنی پسند کی شادی کی۔ (۴۱)

مشتاق احمد یوسفی کے خسر محترم منظور احمد خان نیک اور دین دار انسان تھے جو ہندوستان میں جج کی ذمہ داریاں نبھا رہے تھے۔ ۹۰۔۱۹۸۸ء میں سے کسی سال منظور احمد خان کا انتقال ہوا۔ مشتاق احمد یوسفی کے برادر نسبتی منصور احمد خان وکیل تھے اور کراچی میں اپنی پیشہ وارانہ صلاحیتوں میں کافی معروف ہوئے۔ یہ لوگ بنیادی طور پر آگرہ شریف کے رہنے والے تھے۔ (۴۲)

پسند کی شادیوں میں مسائل زیادہ ہوتے ہیں، تاہم مشتاق احمد یوسفی کی تصانیف سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ انہوں نے ادریس فاطمہ کے ساتھ ایک مثالی ازدواجی زندگی بسر کی ہے۔ ان کی تحریروں میں جہاں کہیں ان کی اہلیہ کا ذکر آیا ہے تشکر آمیز محبت کا لہجہ غالب ہے۔ ان اقتباسات میں محبت، درد اور مٹھاس کی ایسی آمیزش ہے کہ اکثر آنکھیں چھلک اٹھتی ہیں۔ (۴۳)

اللہ تعالی نے مشتاق احمد یوسفی کو چار بچوں سے نوازا ہے، دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ بڑے بیٹے کا نام راشد یوسفی اور چھوٹے کا سروش یوسفی ہے بڑی بیٹی کا نام رخسانہ اور چھوٹی کا سیما ہے۔ ساری اولاد شادی شدہ ہے دونوں بیٹے ارشد یوسفی اور سروش یوسفی انجینئر جب کہ دونوں بیٹیاں رخسانہ اور سیما ڈاکٹر ہیں۔ ارشد یوسفی الیکٹریکل انجینئر ہیں اور اپنے بچوں کے ساتھ امریکہ میں قیام پذیر ہیں۔ جب کہ سروش یوسفی میکینکل انجینئر ہیں اور والد کے ساتھ کراچی میں مقیم ہیں۔ مشتاق احمد یوسفی کی بڑی بیٹی لیڈی ڈاکٹر رخسانہ مانچسٹر (Manchester) کے قریب ایک سرکاری ہسپتال میں ایم

آر سی پی (MRCP) (۴۴) اوران کے شوہر وہیں، جنرل فزیشن ہیں۔ یہ لوگ وہیں مستقل اقامت پذیر ہیں۔ لیڈی ڈاکٹر سیما ماہر امراض جلد (Skin Specialist) ہیں اور کراچی ہی کے ایک ہسپتال میں Consultant ہیں۔

مشتاق احمد یوسفی کی اپنی اولاد اور اولاد کی اولاد، سب کا ذریعہ تعلیم انگریزی ہے۔ اردو زبان اور ادب کے اس بے مثال ادیب اور دانش ور کے افکار اور اسلوب عالیہ کی تفہیم تو ان کے لیے بڑی بعد کی بات ہے وہ تو ان ادیب ساز تصانیف کی محض خواندگی (Just Reading) کے بھی قابل نہیں ہیں۔

قدرت دیکھیے جس گنج علم وادب یوسفی سے مجھ جیسوں نے بھی فیض پایا۔ اُس سے اُن کی اپنی اولاد محروم رہ گئی۔ تاہم ان نتائج کا ذمہ دار اور قصوروار وہ اپنی اولاد کو نہیں ٹھہراتے، اس کے اسباب وہ بڑی فراخ دلی اور وسعت نظری سے کچھ اپنی مصروف زندگی کے ثمرات اور کچھ جدید عہد کے تقاضوں کے اثرات شمار کرتے ہیں۔ (۴۵)

بھارت سے پاکستان ہجرت کرنے کے بعد مشتاق احمد یوسفی نے کراچی کو اپنا مستقر منتخب کیا اور ۱۹۵۰ء سے تا حال کراچی میں مقیم ہیں۔ اس عرصے میں اپنی ملازمت کے باعث انہوں نے نو برس (۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۳ء تک لاہور میں اور گیارہ برس ۱۹۷۹ء سے ۱۹۹۰ء تک لندن میں گزارے، تاہم ان کی باقاعدہ سکونت اور مستقل محبت کراچی ہی سے متعلق رہی (۴۶)

مشتاق احمد یوسفی کے ۸۳ سالہ عرصۂ حیات میں، جن ممالک کو ان کی زیارت کا شرف میسر آیا ان میں عرب امارات، قطر، بحرین، عراق، لبنان، (بیروت) ایران، عمان، سعودی عرب، اٹلی فرانس، جرمنی، امریکہ، پاناما، آئرلینڈ، ساؤتھ افریقہ، زمبابوے اور لندن شامل ہیں۔ انہی اسفار میں حجازِ مقدس کا سفر بھی شامل ہے ۱۹۸۲ میں انہیں حج کے فرض کی ادائیگی کا موقع ملا اور تین چار بار عمرہ کرنے کی سعادت سے بھی نوازے گئے۔ ۱۹۹۵ء تک انہیں جاپان اور چین جانے کا موقع نہ ملا تھا، جس کی انہیں اب کوئی حسرت بھی نہ تھی۔ (۴۷)

اگر مشتاق احمد یوسفی کی تحریروں کا بہ غور مطالعہ کیا جائے تو علم ہوگا کہ انہوں نے خود کو لاحق بیماریوں کا بھی ہنستے ہنستے اور شگفتہ انداز میں اکثر ذکر کیا ہے۔ مختلف انٹرویوز میں بھی اس موضوع پر بات کی گئی ہے وہ بلاشبہ اتنے حساس Conscious ہیں کہ اپنے متعلق تقریباً ہر بات کا ذکر اپنی تحریر

میں کر دیا ہے۔ حیرت ان کے اس اصرار پر ہے کہ حالات زندگی فن کار کے فکر وفن پر زیادہ اثر انداز نہیں ہوتے۔

بینائی کی کمزوری، معدے کی تکلیف، اور دل کا بائی پاس (By Pass) وہ خاص پہلو ہیں، جو مشتاق احمد یوسفی سے متعلق ہیں۔ پچھلے چالیس برسوں سے وہ معدے کے مرض میں مبتلا ہیں۔ شروع میں وہ اسے السر Ulcers خیال کرتے اور اپنی تحریروں میں اسی کے متعلق بتاتے رہے۔ تاہم لندن میں تفصیلی طبی معائنوں کے بعد انہیں پتہ چلا کہ یہ السر نہیں۔ بلکہ ایسوفی جائٹس Esophegytiss ہے۔ انہوں نے ایک انٹرویو میں دل کے دورے کا بھی ذکر کیا(۴۸) حالاں کہ انہیں دل کا دورہ کبھی نہیں پڑا۔ البتہ لندن ہی میں دل کے معائنے کے دوران میں انہیں پتہ چلا کہ دل کی ایک رگ بند ہے اور کسی بھی وقت دل کے شدید دورے کے امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اس لیے لندن سے واپسی سے قبل ستمبر ۱۹۹۰ میں دل کی بائی پاس By Pass جراحی بھی کروائی گئی جس میں ان کی دو رگیں بدلی گئیں:

"ریٹائرمنٹ کے بعد لندن میں آٹھ نو مہینے رہا۔ اس لیے کہ مجھے اپنا فلیٹ بیچنا تھا اور دل کا By Pass کا Operation کروانا تھا تو ستمبر ۱۹۹۰ میں دل کا By Pass ہوا(۴۹) اور ۵ر دسمبر ۱۹۹۰ کو پاکستان واپس آ گیا اور اس کے بعد پھر میں نے پیشہ وارانہ کام نہیں کیا اس لئے کہ مجھے یہ کہا گیا تھا کہ اب یا تو آپ Proffessionally Active رہیں اور اگر لکھنے پڑھنے کا آپ کو شوق ہے تو وہ کریں لیکن دونوں کام آپ بیک وقت نہیں کر سکتے۔ پھر میں نے یہ سوچا کہ جو کچھ کھانا کمانا تھا وہ ہو چکا ہے اب جو تھوڑا بہت وقت بچا ہے وہ میں لکھنے پڑھنے میں گزار دوں، تو اس کے بعد کسی کام کی طرف رخ نہیں کیا(۵۰)

یہ رائے مشتاق احمد یوسفی کی شخصیت کو سمجھنے میں بہت معاون ہے۔ عام انسان میں عمر کے اضافے کے ساتھ ساتھ زندگی اور مادی ضروریات کی ہوس بھی بڑھتی چلی جاتی ہے اور ایسے میں اگر ہر سہولت سے متمتع ہونے کے مواقع بھی میسر ہوں اور انسان پھر بھی اپنا دامن بچا لے جائے تو یہ بڑے حوصلے کی بات ہے۔ مادّے پر روح اور دنیاوی دھن دولت پر ثروت فکر و نظر کو ترجیح دینا مشتاق احمد یوسفی کی شخصیت کا نہایت مضبوط پہلو ہے ایسا تو کل خوش نصیبوں کو عطا ہوتا ہے اگر چہ اس سارے عمل میں انسان کا اپنا انفرادی شخصی فکری نظام نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، لیکن اس طرز حیات کے پیچھے

کبھی کبھی کچھ خوب صورت وخوب سیرت شخصیات کی صحبتوں کا فیض بھی شامل حال ہوا کرتا ہے، بہ قول صاحبزادہ معین نظامی (۵۱):

یہ باتیں علم و دانش کی نہیں ہیں
یہ فیضان نظر ہے ایھا الناس
یہ تاثیر کتب خانہ نہیں ہے
یہ صحبت کا اثر ہے ایھا الناس

ہر شخص زندگی میں چند ایک شخصیات کو پسند کرتا اور ان سے متاثر ہوتا ہے، پھر ان شخصیات کا اثر شعوری اور لاشعوری طور پر اس میں سرایت کرتا رہتا ہے (۵۲) ایک شخصیت خود جتنی بڑی ہوتی ہے، اس کے اندر اثرات کا تنوع بھی اسی قدر ہمہ جہت اور ارفع ہوا کرتا ہے۔ مشتاق احمد یوسفی شخصی زندگی میں تین شخصیات کے حلقۂ اثر میں رہنے کا حوالہ بڑے اعتماد، فخر اور محبت سے دیا کرتے ہیں۔ سب سے پہلے تو اپنے والد عبدالکریم خان یوسفی، پھر مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں اپنے ایم اے فلسفہ کے استاد ڈاکٹر ظفر الحسن اور تیسرے اپنے ایک دوست میاں فضل حسن۔ اپنے والد کے حوالے سے فرماتے ہیں:

''میں اپنے والد سے متاثر ہوا اس معنی میں کہ میں نے ان کو کبھی جھوٹ بولتے نہیں سنا۔ وہ بہت نڈر اور بیباک آدمی تھے۔ سچ بات کہنے میں وہ کبھی ہچکچاتے نہیں تھے۔ انہیں غصہ بہت جلدی آتا تھا کمزوری بھی کہہ سکتے ہیں، مجھ میں بھی ہے لیکن میں نے ان کو بہت راست باز اور اپنے عقائد میں اور اپنے سیاسی عمل میں بہت ہی سچا، مستقل مزاج اور استقامت رکھنے والا آدمی پایا ہے۔ بہت ہی سادہ زندگی تھی ان کی۔ انہوں نے مجھے بہت متاثر کیا۔ (۵۳)

کسی حد تک وہ اپنے خسر منظور احمد خان سے بھی متاثر ہوئے لیکن حقیقی معنوں میں اپنے والد ہی سے متاثر رہے۔ ان سے اثر قبول کرنے کی بڑی وجہ ان کا راسخ العقیدہ اور پابند شرع مسلمان ہونا ہے، یہ دل کے کھرے اور زبان کے پکے لوگ تھے، ایسے پاکبازوں کی صحبت کے دل پذیر اثرات کا اندازہ ہر خاص و عام بآسانی لگا سکتا ہے۔ ایک اور حوالہ بھی نقل کے لائق ہے:

''میری والدہ بہت اچھی نقاد تھیں۔ جب میں اپنے ماضی میں جھانکتا ہوں تو میں

محسوس کرتا ہوں کہ مجھ پر ان کا بہت اثر ہے۔ غالباً یہ انہیں کی حس مزاح، گہرے مشاہدے اور تلون مزاجی کا اثر ان کے بیٹے پر ہوا۔'' (۵۴)

شخصی اعتبار سے نہ سہی لیکن علمی اور ادبی لحاظ سے اس رائے کی بڑی اہمیت ہے اور اسے کسی طور پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ایسا قطعاً ضروری نہیں کہ مشتاق احمد یوسفی کی والدہ خود بھی تخلیقی ادب سے باقاعدہ وابستہ رہی ہوں تاہم ان کے اندر تخلیقی خواص جو کسی ایک آنچ کے منتظر تھے، ہو سکتا ہے کہ اگلی نسل میں اپنی تکمیل کے مراحل طے کر کے مشتاق احمد یوسفی میں مکمل طور پر صورت پذیر ہوئے ہوں۔ حیاتیاتی نظام کے پیشِ نظر اگر نسل در نسل ہونے والے خواص کے نظریے پر غور کیا جائے، تو یہ اشارہ مشتاق احمد یوسفی کی شگفتہ نگاری پر والدہ کی طرف سے مرتب ہونے والے اثرات کی بہترین غمازی کرتا ہے اور ان سے صرف نظر کرنا قرین انصاف نہیں۔

سولہ سترہ برس کے تعلیمی دورانیے میں یقیناً ایسے اساتذہ بھی زندگی میں ضرور آتے ہیں جو کئی ایک پہلوؤں سے انسان کو مرعوب و متاثر کرتے اور مرغوب و معین ٹھہرتے ہیں۔ مشتاق احمد یوسفی اساتذہ میں سے ڈاکٹر ظفر الحسن سے بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ ذیل میں جو رائے نقل کی جا رہی ہے، یہ مشتاق احمد یوسفی کے تصور فکر کو سمجھنے میں بھی بے حد معاون ہے:

''سب سے زیادہ متاثر تو میں ڈاکٹر ظفر الحسن صاحب سے ہوا۔ ڈاکٹر ظفر الحسن صاحب اس زمانے میں علی گڑھ یونیورسٹی میں فلسفے کے چیئر مین تھے۔ رہنے والے غالباً جھنگ کے تھے۔ ان سے زیادہ Sharp اور Analytic دماغ میں نے کسی کا نہیں دیکھا۔ کوئی بات ہو اس کی وہ ایسی تحقیق اور چھان پھٹک کرتے کہ حیرت ہوتی اور ایک نئی روشنی ملتی تھی۔ بہت ہی وجیہ اور خوبصورت آدمی تھے۔ سفید داڑھی تھی، بڑی نورانی۔ مجھے یاد ہے کہ انہوں نے کسی موضوع پر ٹیوٹوریل میں لکھنے کو طالب علموں سے کہا۔ ہم سب لکھ کر ایک ایک مضمون لے گئے۔ میں نے بڑی محنت سے مضمون لکھا انگریزی میں۔ تو لوگ سنانے لگے میری باری آئی تو میں نے سنایا۔ بہت خوش ہوئے کہنے لگے کہ صاحب یہ بتائیے کہ یہ جو آپ نے مضمون اتنا خوبصورت لکھا ہے، اس میں کوئی بات ایسی ہے جو آپ نے پڑھی نہیں ہے کہیں بھی اور صرف آپ نے کہی ہے۔ تو وہ بات، وہ نقطہ، وہ جملہ بتائیے ۔ اب ہم گم، اس لئے کہ وہ ہم نے کتاب میں سے پڑھ کے لکھا تھا۔ اس میں جملے بھی

بہترین تھے،خیال بھی بہترین تھے،سب کچھ جمع کر دیا تھا،مگر ہمارا اس میں کچھ بھی نہ تھا سوائے زبان کے،زبان کی داد ڈاکٹر صاحب نے ہمیں دے دی،تو وہاں سے ہمارا پورا رویہ لکھنے اور سوچنے کے بارے میں بدل دیا۔مضمون نہایت عمدہ تھا کوئی اور استاد ہوتا تو بڑی داد دیتا۔تو وہ بس ایم اے میں جاتے ہی ڈاکٹر صاحب سے مڈبھڑ ہوگئی،انہوں نے بہت کچھ دیا،اللہ انہیں غریق رحمت کرے۔(۵۵)

محض اپنی ہی ذات میں محدود ہو کر انسان زندگی کا سارا حسن کشید نہیں کر سکتا،اس لئے دوستی کی اہمیت اور افادیت زندگی کے کسی مرحلے پر بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی اور ایسے شخص کے مفلس ہونے میں کیا شک ہوتا ہے،جس کا کوئی دوست نہ ہو۔دیگر شعبۂ ہائے حیات کی مختلف النوع شخصیات کی طرح انسان زندگی میں اپنے دوستوں کا بھی بے حد اثر قبول کرتا ہے،بظاہر یہ اثر دکھائی نہیں دیتا لیکن در پردہ دوستوں کا حلقۂ اثر طلسماتی تاثیر کا حامل ہوتا ہے۔میاں فضل حسن،مسرت علی صدیقی،شیخ منظور الٰہی،مختار مسعود،ڈاکٹر آفتاب احمد،مسعود مفتی،ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب،افتخار عارف،نور الحسن جعفری،ابن انشاء،شفیق الرحمٰن،کرنل محمد خان،سید ضمیر جعفری یوں تو مشتاق احمد یوسفی کے دوستوں میں شامل ہیں۔لیکن ان میں کچھ گہرے دوست ہیں،کچھ سے تعلق خاطر اور کچھ سے چند ایک ملاقاتیں ہیں۔تاہم میاں فضل حسن جو چنیوٹ کے رہنے والے تھے۔ان کی محبت اور ذہانت سے حقیقی معنوں میں مشتاق احمد یوسفی بہت متاثر ہوئے۔ان کی اکثر گفتگو اور انٹرویو میں میاں فضل حسن کا ذکر آتا ہے۔''آب گم'' کے دیباچے میں بھی ان کا بڑا توانا ذکر موجود ہے۔(۵۶)

اگرچہ مشتاق احمد یوسفی نے مسرت علی صدیقی کا اس ضمن میں بہت زیادہ ذکر تو نہیں کیا،لیکن مسرت علی صدیقی سے بھی وہ بہت متاثر ہوئے،یہ اس لئے کہ ''آب گم'' میں 'بشارت' کے نام سے جو کردار انہوں نے تخلیق کیا،وہ مسرت علی صدیقی ہی کا ہے۔ایسا جاندار کردار شدید متاثر ہوئے بغیر تخلیق کرنا یقیناً ممکن نہیں۔(۵۷)

سماجی شخصیات میں کوئی خاص شخصیت ایسی نہیں ہے جس نے انہیں متاثر کیا ہو،البتہ:

''عزت کرتا ہوں جو لوگ کام کر رہے ہیں،جیسے ایدھی صاحب یا اختر حمید خان صاحب ہیں'اورنگی پائلٹ پراجیکٹ'والے یا ادھر اسلام آباد میں 'بہبود ایسوی ایشن' کی اختر ریاض الدین صاحبہ ہیں،ادبیہ بھی ہیں تو یہ بڑے لوگ ہیں۔''(۵۸)

انگریزی ادب میں زیادہ پسندیدہ لکھنے والے مارک ٹوین(Mark Twain) ہیں۔ اسٹیفن لیکاک(Stephan Leacock) سے بھی متاثر ہیں اور اردو ادب میں غالب کے اثرات اُن کے فکروفن پر زیادہ غالب دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن یہ بات اپنی جگہ بہت اہم ہے کہ اُردو کے تقریباً تمام مستند اسالیب کی جھلک ان کے ہاں دکھائی دیتی ہے، جو کسی کرامت سے کم نہیں۔

کسی شخصیت کا تجزیہ کرنے کے لئے جہاں اس کے دوستوں اور عزیز و اقارب کی گواہیاں ممد و معاون ثابت ہوتی ہیں وہاں اس کی ذاتی پسند و ناپسند اس کے مشاغل، اس کی سوچ، فکری تضادات غرضیکہ تمام اسلوبِ حیات زیرِ بحث آتا ہے۔ لیکن پسند و ناپسند کے متعلق مشتاق احمد یوسفی نے اپنی کتابوں اور انٹرویوز میں گاہے گاہے پردہ کشائی کی ہے۔ ان کی سوانح اور شخصیت کی بہتر تفہیم کے لئے اس سوانحی خاکے کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے جو ہم نے اس سے قبل ان کی تحریروں سے ترتیب دیا ہے۔ یہاں اس خاکے کا ایک ناکافی 'اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

> ''رنگوں میں زرد رنگ، خوشبوؤں میں عطر شمامہ استعمال کرتے ہیں فوٹو گرافی اور جانور پالنے کا مشغلہ دیر تک اپنائے رکھا۔ پالتو جانوروں میں کتوں سے بہت پیار کرتے ہیں، البتہ بلی سے انہیں کوئی رغبت محسوس نہیں ہوئی۔ ۱۹۶۳ء میں ایک بندر بھی پالا، جس کا نام بر بنائے انتقام، ڈارون رکھا۔ (۵۹)

خرگوش، مرغیاں اور طوطا بھی پالتے رہے۔ لاہور ان کا پسندیدہ شہر ہے، تاہم کراچی سے انہیں اس لیے بے حد محبت ہے کہ یہاں ان کا رزق اترا اور ''جہاں سے رزق ملے' اس جگہ سے، وہاں کے لوگوں سے محبت کرنی چاہیے' ورنہ بندہ Nostalgia میں مبتلا ہو جاتا ہے۔'' (۶۰)

گھر میں شلوار قمیص میں رہتے اور اس لباس کو پسند کرتے ہیں۔ باہر البتہ پینٹ کوٹ پہنتے ہیں۔ شراب نہیں پیتے، البتہ کالج کے زمانہ طالبِ علمی سے ۱۹۷۹ء تک سگرٹ نوشی کرتے رہے ہیں، لندن جانے کے بعد یہ کفر بھی ٹوٹ گیا۔ کتابوں سے عشق کرتے ہیں۔ جلدی غصے میں آجانا ان کی شخصیت کی خامی ہے۔ ایک خامی اور بھی ہے، خط کا جواب نہیں دیتے۔ اپنی ذات کی حد تک تو ہم بھی اس امر کی گواہی دے سکتے ہیں۔

نہایت خوش ذوق آدمی ہیں۔ ان کی خوش ذوقی کا اندازہ ان کے ڈرائنگ روم سے بھی ہوتا ہے، (جہاں بیٹھ کر ہم نے ان سے انٹرویو کیا) خوبصورت اور نفیس Paintings دیواروں کے ساتھ

آویزاں ہیں۔ کچھ مورتیاں بھی کونوں میں رکھی ہیں (۶۱) اور ہر مورتی کے سامنے سپاٹ لائٹ رکھی ہے جوان مورتیوں کو نیم روشن کر کے عجیب رومانوی فضا پیدا کرتی ہیں۔

۱۹۹۵ء میں ان کے ایک ڈرائیور دلاور خان ہوا کرتے تھے۔(۶۲) ان سے بھی ہماری گفتگو ہوئی تھی۔ دلاور خان نے بتایا تھا کہ صاحب (مشتاق احمد یوسفی) بہت ہی اچھے اور مہربان آدمی ہیں۔ گھر کا سارا حساب کتاب اور گھر چلانے کا کام بڑی بیگم صاحبہ (ادریس فاطمہ) کرتی ہیں۔ صاحب اور بیگم صاحبہ اعتدال پسند ہیں۔ مکتبہ دانیال (کراچی) کی ناشر حوری نورانی نے بتایا کہ یوسفی صاحب بہت ہی مہربان اور وضع دار آدمی ہیں، جب میرے والد ملک نورانی سرطان (Cancer) کے مرض میں مبتلا ہو کر نومبر ۱۹۸۹ء میں شکاگو (امریکہ) کے ایک ہاسپٹل میں زیر علاج تھے۔ تو یوسفی صاحب لندن سے ہر ہفتے شکاگو فون کے ذریعے سے بیمار پرسی فرمایا کرتے تھے (۶۳)

کرنل محمد خان راقم کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''مہربان، مخلص، خلیق اور خوش مزاج، نہایت ہی پیارے اور ملنسار آدمی ہیں۔ اگر کوئی خامی ہے (اور لازماً ہوگی) تو مجھے اس کا علم نہیں مجھے تو ان میں یکے بعد دیگر درجنوں خوبیاں ہی نظر آئیں، خاص دوستوں میں کھلی کتاب کی طرح ہیں، ویسے کم گو ہیں۔'' (۶۴)

ان کے قریبی دوست مسرت علی صدیقی ان کے متعلق ایک خط میں لکھتے ہیں:

''دیسی عطریات میں عطر شمامہ پسند کرتے ہیں، چنانچہ ان کے دوستوں کو ان کی دوستی میں شمامۃ العنبر کی خوشبو آتی ہے۔ اپنی تحریروں کے علاوہ ایک ایسی باغ و بہار شخصیت کے مالک ہیں کہ محفل کو اپنی شگفتہ بیانی اور مزاح کی آمیزش سے زعفران زار بنا دیتے ہیں اور یوں دیکھئے تو وہ نہایت ہی حلیم، بردبار اور سنجیدہ شخصیت کے حامل ہیں۔ ان کی شخصیت کا یہ رویہ صرف ان کے بے تکلف احباب ہی کی محفلوں میں نظر آ سکتا ہے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی ان کی انکساری ہے، بڑے بڑے عہدوں پر پہنچنے کے بعد بھی وہ اپنے قدیم دوستوں کو نہیں بھولے اور آج بھی اسی گرویدگی اور اخلاص سے ملتے ہیں، جیسے کبھی اپنے کیریئر کی ابتداء میں ملا کرتے تھے۔'' (۶۵)

سید ضمیر جعفری انہیں اردو کے مسکراتے ہوئے فلسفی کا خطاب دیتے ہوئے ان کی فکری وفنی

حیثیت کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت پر بھی بڑی عمدہ گفتگو کرتے ہیں:

''دوست داری ان کی شخصیت کی بڑی محکم اور بڑی ہی روپہلی چھاپ ہے۔ دوست بناتے وقت وہ دوست کو ایک آنکھ سے دیکھتے ہیں اور دوست بنانے کے بعد دوست کی طرف سے دونوں آنکھیں بند کر لیتے ہیں......اپنے معاصر مزاح نگاروں میں ہر وقت کسی نہ کسی کی جوتیاں سیدھی کرنے پر کمر بستہ رہتے ہیں......اپنے بارے میں ناگوار باتیں خندہ پیشانی سے سنتے ہیں'' (٦٦)

شان الحق حقی کا نام بھی کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ آکسفورڈ لغت کا اردو ترجمہ ان کا قابل قدر اور یادگار کام ہے۔ دیکھئے یوسفی صاحب کی کیسی دل آویز تصویر کھینچتے ہیں:

''یوسفی صاحب کی شخصیت ہر طرف سے اتنی مستحکم ہے کہ مجھے اس میں کہیں بھی کوئی جھوک، کوئی جھول، کوئی لٹک نظر نہیں آئی۔ میری نظر کا قصور بھی ہو سکتا ہے، جو ان کی نظر کی طرح تیز نہیں، جو حقائق کے پار تک دیکھ لیتی ہے، لاموجود کو موجود کر دکھاتی ہے اور ان کے کہے کو ماننا پڑتا ہے۔'' (٦٧)

مشتاق احمد یوسفی کو بہت قریب سے جاننے والوں نے ان کی حق گوئی، پرہیز گاری اور ان کے پابند شرع ہونے کے بھی اشارے دیے ہیں مثلاً افتخار عارف صاحب نے ہماری کتاب: 'یوسفیات' کا قلمی نسخہ پڑھ لینے کے بعد، جب رائے قلم بند فرمائی، تو ایک اضافی خط لکھتے ہوئے اس امر کی طرف ہماری توجہ دلائی کہ ہم نے مشتاق احمد یوسفی کی شخصیت میں تقویٰ کے پہلو کو زیادہ واضح نہیں کیا۔ یہ بات بذات خود مشتاق احمد یوسفی کی پرہیز گاری کا واضح اشارہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت میں فکری اعتدال اور بے تعصبی کا وصف بھی بہت نمایاں ہے:

''ہم نہ ضعیف الاعتقاد ہیں، نہ وہابی۔'' (٦٨)

اختیارات کا جادو سر چڑھ کر بولتا اور اکثر سر لے کر اترتا ہے، کیوں کہ 'کار جہاں گیری، کار فقیری سے دشوار تر ہوا کرتا ہے۔ اختیار و اقتدار کا نشہ اچھے اچھوں کے ہوش و حواس کا قاتل ثابت ہوتا ہے۔ ہماری تاریخ اس اعتبار سے کافی غیر معتبر اور نا قابل فخر ہے اور اس ضمن میں کسی مثال کے بغیر بھی کام چلایا جا سکتا ہے۔ شروع میں ذکر ہوا کہ مشتاق احمد یوسفی نے مجسٹریٹ، ڈپٹی کمشنر اور ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر کے با اختیار عہدوں سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا اور دسمبر ۱۹۴۹ء میں محض اس وجہ سے تمام

عہدوں کو لات مار کر پاکستان چلے آئے کہ اب وہاں کی سرکاری زبان اردو نہیں رہی۔ آئے بھی کیسے، خالی ہاتھ اور وہ بھی اونٹ کی کوہان پر بیٹھ کر (۲۹) زبان اردو سے ایسی محبت ہم میں سے کتنوں نے کی ہے؟ بہر حال یہ استغنا بھی ان کے مزاج میں رچے بسے درویشانہ اسلوب اور تقویٰ کی دلیل ہے۔ تاہم مشتاق احمد یوسفی کا پابند شرع، راسخ العقیدہ اور پرہیز گار ہونا اس امر سے بھی واضح ہے کہ ان کو متاثر کرنے والی شخصیات حق گوئی اور تقویٰ میں بے مثال تھیں۔ کلمۂ حق کہنے کا وصف ان کے ہاں موروثی تو ہے ہی، اکتسابی بھی ہوگا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات کے عوض جو اعزازات میسر آئے، ان کے ساتھ معقول رقوم بھی شامل ہوتی ہیں، مثلاً 'کمال فن ایوارڈ کے ساتھ پانچ لاکھ روپے کا چیک عطا کیا گیا اس رقم کا تو ہمیں پتہ نہیں، لیکن ہلال امتیاز کے ساتھ ملنے والی کثیر رقم انہوں نے ایدھی ویلفیئر ٹرسٹ اور شوکت خانم میموریل ٹرسٹ کو عطیہ کر دی، اس سے بھی ان کے تقویٰ کے پہلو کو تقویت ملتی ہے۔ اسی طرح بی سی سی آئی (لندن) سے ریٹائرمنٹ اور دل کی سرجری کے بعد ان کا پیشہ وارانہ مصروفیات کے مقابل علمی اور ادبی مشاغل کو ترجیح دینا بھی، ان کی شخصیت کے اسی پہلو کا عکس پیش کرتا ہے۔

ایک انسان کی حیثیت سے مشتاق احمد یوسفی قابل رشک شخصیت کے مالک ہیں، اگر درج بالا تمام پہلوؤں کو سامنے رکھا جائے اور ان کی نفسیاتی (Psychological) توجیہ و توضیح کی جائے، تو یہ عناصر ان کی شخصیت اور کردار کے کئی مخفی گوشوں کو بے نقاب کرتے ہیں۔

انتہائی بااصول اور کمال پسند (Perfectionist) مشتاق احمد یوسفی، پاکیزہ سوچ اور انتہائی نفیس خیالات کے حامل ہونے کے ساتھ ساتھ شفیق، ملنسار، محبت کرنے والے، ہمدرد، محنتی، خوددار، پابند شرع، پرہیزگار، راسخ العقیدہ، حق گو، منکسر و معتدل مزاج اور وضع دار و وفاشعار انسان ہیں۔ انہیں غصہ بہت آتا ہے۔ ان کی تحریروں سے انسان دوستی اور ہمدردی کے آثار شدت سے ہویدا ہوتے ہیں، یاد رکھیئے کہ بڑھتے ہوئے ہمدردی کے احساس کے باعث انسان کو غصہ بہت آتا ہے، یوں شدید حساسیت اور زود رنجی کی کیفیت بھی پیدا ہو جاتی ہے، تاہم حلیم الطبع اور بردبار ہونے کا وصف انہیں اس مشکل سے بھی سلامتی اور سہولت سے نکال لے جاتا ہے۔

مسرت علی صدیقی (جن کا قلمی نام مسرت علی سُرور ہے) نے اپنے شعری مجموعے 'نوائے بے نوا' میں مشتاق احمد یوسفی کے لئے تین نظمیں کہی ہیں، یہ نظمیں بھی مشتاق احمد یوسفی کی پرکشش اور

جاذب نظر شخصیت کی آئینہ دار ہیں۔

مشتاق احمد یوسفی نے اسکول کے زمانے ہی سے لکھنا شروع کر دیا تھا لیکن اسے محض ریاض اور مشق خیال کرنا چاہیے، با قاعدہ لکھنے کا آغاز تعلیم مکمل کر لینے کے بعد انہوں نے اپنے لئے خود کیا(۷۰)اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ان کے انداز تحریر و تقریر میں ڈاکٹر ظفر الحسن کے رویے کا خاص عمل دخل ہے، جس کا حوالہ گزشتہ صفحات میں دیتے ہوئے یہ گزارش کی گئی تھی کہ اسے مشتاق احمد یوسفی کا نظریۂ فن تصور کرنا چاہئے۔

مشتاق احمد یوسفی نے اپنے ادبی کیریئر کا آغاز ''مشتاق احمد'' کے قلمی نام سے کیا اور اس کی وجہ وہ بینک کی ملازمت بیان کرتے ہیں، یہاں ان کی اپنی رائے سے استفادہ کرتے ہیں:

> ''Banking کی وجہ سے مجھے ادب میں تو کوئی تکلیف نہیں ہوئی، لیکن ادب کی وجہ سے مجھے Banking میں بہت تکلیف ہوئی اور جیسا کہ میں نے لکھا ہے کہ ان شعبوں میں جیسے Banking ہے، Engineering ہے، Insurance ہے۔ ان میں Intellectual آدمی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ اس سے بڑی گالی ان پیشوں میں کوئی ہے ہی نہیں۔ تو میری خوش نصیبی رہی کہ میرے بارے میں بہت بعد میں پتہ چلا کہ میں لکھتا بھی ہوں، مثلاً میں پہلے ''مشتاق احمد'' کے نام سے لکھتا تھا اور بینک فائل میں ''ایم اے کے یوسفی'' درج ہے۔ تو ''چراغ تلے'' آنے کے بعد پورا نام میرا واضح ہوا لوگوں پر۔ اس وقت تک میں اپنے پیشے میں کافی ترقی کر چکا تھا اور پھر میرا کچھ آسانی سے کوئی بگاڑ نہیں سکتا تھا۔''(۷۱)

''صنفِ لاغر'' مشتاق احمد یوسفی کا پہلا با قاعدہ مطبوعہ مضمون ہے، جو طباعت کے لئے سب سے پہلے معروف ادبی جریدے: ماہنامہ ادب لطیف' لاہور کو ارسال کیا گیا، جس کے مدیر اُن دنوں میرزا ادیب ہوا کرتے تھے۔ میرزا ادیب کو مضمون کے مرکزی خیال سے اتفاق نہیں تھا، اس لیے یہ مضمون مشتاق احمد یوسفی کو معذرت کے ساتھ واپس ارسال کر دیا گیا۔ پھر ترقی پسندانہ خیالات کے حامل رسالے: ماہنامہ 'سویرا' لاہور کو یہ مضمون ارسال کیا گیا، جس کے مدیر حنیف رامے تھے، انہوں نے اس مضمون کا بڑا مثبت اور حوصلہ افزا جواب ارسال کرتے ہوئے مشتاق احمد یوسفی کو مزید مضامین لکھنے کی بھی تاکید کی۔

یوں مشتاق احمد کے نام سے ۱۹۵۵ء میں ماہنامہ 'سویرا' لاہور سے مشتاق احمد یوسفی کی ادبی زندگی کا باضابطہ آغاز ہوا اور 'صنفِ لاغر' پہلے مضمون کے طور پر شائع ہوا۔ اس کے بعد ماہنامہ 'سویرا' ہی میں بالترتیب ان کے مضامین چارپائی اور کلچر، کرکٹ اور کاغذی ہے پیرہن شائع ہوئے (۷۲) 'مشتاق احمد' کے نام سے ہفت روزہ 'نصرت' کے پرچے میں بھی ایک مضمون 'موسموں کا شہر' شائع ہوا (۷۳) صہبا لکھنوی کی ادارت میں شائع ہونے والے ادبی جریدے ماہنامہ 'افکار' کراچی میں ان کے مضامین 'تو نے پی ہی نہیں'، 'اور آنا گھر میں مرغیوں کا' اور 'جنونِ لطیفہ' اسی ترتیب سے شائع ہوئے (۷۴) یہ آٹھوں مضامین نظرِ ثانی کے بعد ان کی پہلی کتاب ''چراغ تلے'' میں شائع ہوئے۔ تو نے پی ہی نہیں' کا نام بدل کر 'کافی' رکھ دیا گیا۔ ادبی مجلہ 'ادبی دنیا' جو مولانا صلاح الدین لاہور سے نکالتے تھے، اُس میں بھی ایک مضمون ہوئے مر کے ہم جو رسوا (۷۵) اور احمد ندیم قاسمی کے جریدے: سہ ماہی 'فنون' لاہور میں ایک مضمون 'چند تصویر بتاں' شائع ہوا (۷۶) بعد ازاں یہ دونوں مضامین قطع و برید کے بعد ان کی دوسری کتاب ''خاکم بدہن'' میں شامل ہوئے۔ ان مضامین کے بعد انہوں نے رسائل و جرائد میں اپنے مضامین کی اشاعت کا سلسلہ قطعی طور پر بند کر دیا۔ بہت دیر بعد روزنامہ 'جنگ' کراچی کے ادبی ایڈیشنوں میں ان کا مضمون 'حویلی' چھ اقساط میں سلسلہ وار شائع ہوتا رہا (۷۷) بعد میں یہ مضمون ان کی چوتھی کتاب ''آبِ گم'' میں ایک پورے باب کے طور پر شامل کیا گیا۔

مجموعی طور پر مشتاق احمد یوسفی نے رسائل و جرائد اور اخبارات کے لئے بہت کم لکھا ہے۔ وہ کسی اخبار کے فکاہیہ کالم سے بھی وابستہ نہیں رہے کہ جہاں محض کاغذ کا پیٹ بھرنے کے لئے بہر حال کچھ نہ کچھ لکھنا پڑتا ہے، البتہ مختلف تقریبات کے لیے انہوں نے فرمائشی مضامین ضرور لکھے اور عوام کے ذوق اور رُجحانات کو ملحوظِ خاطر بھی رکھا، لیکن اپنے معیار کا دامن پھر بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ یہ تقریباتی مضامین ان کی کتابوں کا حصہ نہیں بنے اور نہ ہی کسی علیحدہ کتابی صورت میں تدوین وطباعت کے مراحل سے تاحال گزرے ہیں۔

۵ر فروری ۱۹۶۱ء کو مشتاق احمد یوسفی نے 'پہلا پتھر' کے نام سے اپنے مضامین پر مشتمل پہلی کتاب کا مقدمہ لکھا اور ۱۹۶۱ء میں ۳۸ سال کی عمر میں ان کی پہلی کتاب ''چراغ تلے'' زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آئی۔ (۷۸) یہ کتاب پہلے پہل ''مکتبہ جدید لاہور'' سے شائع ہوئی اور پھر اس کتاب کو مکتبہ دانیال کراچی کے پلیٹ فارم سے شائع کیا گیا۔ اس ادارے سے اب تک اس کتاب

کی گیارہ اشاعتیں عمل میں آچکی ہیں۔

'چراغ تلے' میں شامل مضامین کو انہوں نے 'کھٹ مٹھے مضامین' کہا ہے اور ان پر کسی خاص صنفِ ادب کی مہر ثبت نہیں کی (بعد میں ان مضامین کو 'انشائیے' کہا گیا، جو کہ درست نہیں) 'چراغ تلے' کا انتساب ''والد مرحوم' کے نام ہے چراغ تلے میں بارہ مضامین شامل ہیں جو پڑیئے گر بیمار' کافی' یادش بخیر یا' موذی' سنہ' جنونِ لطیفہ' چارپائی اور کلچر اور آنا گھر میں مرغیوں کا' کرکٹ صنف لاغر' موسموں کا شہر اور کاغذی ہے پیرہن کے عنوانات اور ترتیب سے موجود ہیں۔ ان میں سے آٹھ مضامین سویرا لاہور نصرت لاہور اور افکار کراچی میں شائع ہوئے۔

'چراغ تلے' کی اشاعت کے ۹ سال بعد ان کی دوسری کتاب ''خاکم بدہن'' جنوری ۱۹۷۰ء میں ''مکتبہ اردو ڈائجسٹ سمن آباد لاہور'' سے شائع ہوئی، جس کا مقدمہ ۲۴ راکتوبر ۱۹۶۹ء کو ''دست زلیخا'' کے نام سے مکمل ہوا۔ بعد میں اسے بھی ''مکتبہ دانیال کراچی'' سے شائع کیا گیا۔

''خاکم بدہن'' میں آٹھ مضامین شامل ہیں' جنہیں انہوں نے ''خاکے اور مزاحیے'' کا نام دیا۔ 'خاکم بدہن میں صبغے اینڈ سنز' سیزر ماتا ہری اور مرزا، بارے آلو کا کچھ بیاں ہوجائے، پروفیسر، ہوئے مر کے ہم جو رسوا، ہل اسٹیشن، بائی فوکل کلب اور چند تصویر بتاں شامل ہیں مکتبہ دانیال کراچی کے تحت یہ کتاب اب تک چودہ مرتبہ شائع ہوچکی ہے۔ اس کتاب کو انہوں نے اپنی زوجہ محترمہ ادریس فاطمہ کے نام' منسوب کیا۔ 'خاکم بدہن' کو ۱۹۷۱ء میں آدم جی ادبی ایوارڈ'' سے نوازا گیا۔ جو بقول شخصے آدم جی ادبی ایوارڈ کی حوصلہ افزائی تھی۔

'خاکم بدہن کی اشاعت کے ٦ سال بعد ۲ر جنوری ۱۹۷٦ء کو ''تزک یوسفی'' کے نام سے مشتاق احمد یوسفی نے اپنی تیسری کتاب زرگزشت کا مقدمہ قلم بند کیا۔ یہ یکم اپریل ۱۹۷٦ء کو مکتبہ دانیال کراچی سے پہلی مرتبہ شائع ہوئی اور اب تک اس کی نو اشاعتیں عمل میں آچکی ہیں۔ زرگزشت' مشتاق احمد یوسفی کی Banking Life کے روز و شب کی داستان ہے، جو پچیس برسوں پر محیط ہے۔ اسے انہوں نے اپنی سوانح نوعمری'' کہا ہے۔ زرگزشت' ۱۹۵۰ء (جب انہوں نے جنوری ۱۹۵۰ کی پہلی صبح کو سرزمین پاکستان پر قدم رکھا) سے لے کر ۱۹۷۵ء کے دورانیے اور گیارہ ابواب پر مشتمل ہے' یہ ابواب' سبق یہ تھا پہلا کتاب ریا کا'، رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر، کیا کوئی وحشی اور آ پہنچا یا کوئی قیدی چھوٹ گیا، علم دریاؤ' پروٹوکول' فینی ڈارلنگ' کوئی قلزم کوئی دریا کوئی قطرہ مدد دے، جانا ہمارا

کاک ٹیل پارٹی میں، ناٹک ،موصوف اور موصوفہ کے عنوانات سے مزین ہیں۔اس کتاب کا مقصد محض خود کو اجاگر کرنا ہی نہیں بلکہ معاشرہ کے مثبت و منفی رویوں پر بھی روشنی ڈالنا ہے۔۱۹۷۶ء میں اس کی اشاعت کے ساتھ ہی اسے بھی ''آدم جی ادبی ایوارڈ'' سے نوازا گیا۔زرگزشت کا انتساب ''فضل حسن اور مسرت علی صدیقی کے نام'' ہے۔جو ان کے دوست ہیں (۷۹)

۱۹۷۹ء میں مشتاق احمد یوسفی لندن، برطانیہ (England) چلے گئے۔زرگزشت کے ۱۴برس بعد'' غنودیم غنودیم'' کے زیر عنوان ۱۶/اکتوبر ۱۹۸۹ء کو اپنی چوتھی کتاب ''آب گم'' کا مقدمہ تحریر کیا اس کی پہلی اشاعت فروری ۱۹۹۰ء میں مکتبہ دانیال کراچی سے ہوئی۔

''آب گم'' برصغیر پاک و ہند کی تقسیم کے پس منظر میں ہجرت کر کے آنے والوں پر ہجرت کے بعد کے حالات اور تقسیم ہند کے (خوشگوار و ناگوار) نتائج پر روشنی ڈالتی ہے۔اس کے علاوہ اپنے Land Scape اور سیاسی و سماجی اور مرتی ہوئی اقدار کے حوالوں کی ایک ایسی دستاویز ہے' جو اپنی بنت کے لحاظ سے مونتاژ کہے جانے کے لائق ہے،تاہم جدید ناول نگاری کے بھی قریب تر ہے اور نثر عالیہ کے حوالے سے دنیا کے ادب میں بھی رکھے جانے کے لائق ہے۔یہ سراسر ہماری ذاتی رائے ہے اور یہ قطعاً ضروری نہیں کہ اس سے اتفاق نہ کیا جائے۔

'آب گم کا انتساب'' اپنے بچوں ارشد' سروش' رخسار اور سیما کے نام'' ہے۔مکتبہ دانیال کراچی 'ہی سے یہ کتاب چار بار شائع ہو چکی ہے۔آب گم کے پانچ ابواب حویلی، اسکول ماسٹر کا خواب، کار کابلی والا اور الہ دین بے چراغ' شہر دو قصہ اور دھیرج گنج کا پہلا یادگار مشاعرہ شامل کتاب ہیں۔اس کتاب پر انہیں 'ہجرا ایوارڈ'' (ہجرہ ایوارڈ) دیا گیا۔

'آب گم' کے مقدمے سے پتہ چلتا ہے کہ زرگزشت' کا دوسرا حصہ بھی لکھا گیا تھا' جسے شائع بھی ہونا تھا' نیز آبِ گم کے علاوہ پانچ مزید اسی نوعیت کے طویل مضامین تھے جو لندن ہی میں رقم ہوئے تھے لیکن مشتاق احمد یوسفی کے مطابق یہ دونوں کتابیں اب خواب ہوئیں اب ایک اور پانچویں کتاب جو مکمل پڑی ہے۔مدتوں سے اپنی اشاعت کا راستہ دیکھتی ہے' جس کے متعلق انہوں نے صرف اتنا ہی بتایا کہ نئی کتاب میں تمام ابواب ایک مرکزی کردار کے گرد گھومتے ہیں:

> ''میں چاہتا ہوں کہ پانچویں کتاب آئے تو وہ تھوڑی مختلف ہو۔بجائے اس کے کہ اسی کو میں Continue کروں' تو اس میں میری دلچسپی ختم ہوگئی ہے ایسا ہے میں

کتاب لکھ کر تو ڈال دیتا ہوں پھر ایک عرصے کے بعد دوبارہ پڑھتا ہوں اود یکھتا ہوں کہ کیا اس میں کوئی نئی بات ہے یا بس یونہی لکھی گئی۔''(۸۰)

مشتاق احمد یوسفی کا تصور فن سمجھنے کے لیے محولہ بالا رائے کو سمجھنا بے حد ضروری ہے گزشتہ صفحات میں مشتاق احمد یوسفی کی ادبی زندگی کے جو حقائق بیان ہوئے ہیں ان کی روشنی میں یہ اندازہ لگانا کیا مشکل ہے کہ ۱۹۶۱ء سے ۲۰۰۶ء تک ان کی چار تصانیف منظر عام پر آئی ہیں۔

غور کیا جائے تو مشتاق احمد یوسفی زیادہ نہ بھی سہی ۱۹۵۲،۱۹۵۳ء سے تو باقاعدہ لکھ رہے ہوں گے کیوں کہ ۱۹۵۵ء میں ان کا پہلا مضمون ''صنف لاغر'' ماہنامہ ''سویرا'' میں شائع ہوا ہے یوں ایک محتاط اندازے کے مطابق وہ تقریباً ستاون اٹھاون برسوں سے لکھ رہے ہیں اور اس طویل عرصے میں انہوں نے محض چار کتابیں تصنیف کی ہیں۔ کسی لکھنے والے کا اس سے زیادہ ریاض اور ضبط کیا ہوگا کہ وہ تقریباً ساٹھ برسوں میں چار کتابیں لکھے اور کتابیں بھی ایسی جنھیں ہر بڑے سے بڑا ناشر شائع کرنا اور بیچنا اپنے لئے اعزاز کا باعث سمجھے' جب کہ ناشرین کے اس اعزار کے علاوہ خود مصنف کے لئے وافر دولت کمانے کے ان گنت مواقع بھی زود یاب ہوں ایسے میں اگر مشتاق احمد یوسفی جیسا توانا تخلیقی قلم رکھنے والا ادیب، اگر عوام کے معیار پر لکھنا شروع کردے، تو خود سوچ کہ کیا کچھ ممکن نہیں۔

دراصل مشتاق احمد یوسفی نے سستی شہرت کمانے کا بہر حال کوئی جتن نہیں کیا' انہوں نے اپنے فن پر بھرپور توجہ دی، صبر اور ریاضت سے کام لیا' حوصلے اور ضبط کے ساتھ لکھا پھر جو کچھ خود سے شائع کیا اپنی کتابوں ہی میں شائع کیا وہ تراش تراش کر (۸۱) اور پھونک پھونک کر قلم رکھنے والے فنکار ہیں۔ یوں مشتاق احمد یوسفی کی بڑھی ہوئی احتیاط پسندی نے انہیں اعلیٰ درجے کا ادیب ضرور بنادیا۔ حالاں کہ راجستھان کے ایک پٹھان سے، جس کی مادری زبان مارواڑی ہو، ایسی ادبی زبان تحریر کرنے کی توقع بھلا کب کی جاسکتی ہے؟ لیکن ایسا ہوا اور پھر ایک دن آیا، جب یہ پٹھان اقلیم زبان وادب اردو کا شہنشاہ نامزد ہوا اور اردو ہی پر کیا موقوف، مشتاق احمد یوسفی انگریزی زبان میں لکھنے کی شاید اس سے بھی زیادہ استعداد اور توفیق رکھتے ہیں، لیکن صد شکر کہ انہوں نے اپنے اظہار کے لیے اردو زبان وادب کو اپنا وسیلہ بنا کر اس کا دامن چراغ تلے' خاکم بدہن' زرگزشت اور آب گم جیسے کوہ نور ہیروں سے مالا مال کردیا۔

مشتاق احمد یوسفی کبھی بھی کسی بھی معروف یا غیر معروف چھوٹی یا بڑی تنظیم اور تحریک کے رکن

نہیں رہے اس لیے کہ وہ خود ایک ادارہ اور اپنی ذات میں ایک تنظیم اور تحریک کا درجہ رکھتے ہیں، حالاں کہ مختلف نوعیت کی تحریکوں اور تنظیموں نے دل ہی دل میں کتنی دعائیں کی ہوں گی کہ مشتاق احمد یوسفی محض ایک دفعہ اس کے کسی طور پر رکن بن کرا سے وقار بخشیں۔

۱۹۷۱ء میں 'خاکم بدہن'' کی اشاعت کے بعد مشتاق احمد یوسفی کو آدم جی ایوارڈ عطا کیا گیا۔ زر گزشت کی اشاعت بھی آدم جی ادبی ایوارڈ سے نوازی گئی۔ اب آب گم کی اشاعت پر انہیں 'ہجر ایوارڈ' دیا گیا۔ اس کے علاوہ مجموعی طور پر مشتاق احمد یوسفی کو ان کی ادبی خدمات پر ''ستارۂ امتیاز'' سر فراز کیا گیا(۸۲) ۱۹۹۶ء میں انہیں بولان ایوارڈ ۲۰۰۰ء میں کمالِ فن ایوارڈ اور ۲۳ ر مارچ ۲۰۰۲ء کو ان کی خدمات میں مجموعی علمی وادبی خدمت کے حوالے سے ہلالِ امتیاز پیش کیا گیا۔ (۸۳)

ہمیں یہ کہنے میں کوئی عذر اور تامل نہیں کہ یہ سارے اعزازات ہمارے عہد کے ایک بڑے ادیب کے فن کا کم سے کم اعتراف واظہار ہے اور یہ بھی درست ہے کہ یہ اعزازات خود یوسفی شناسی کی دلیل ہیں۔ ایک آخری بات یہ بھی عرض کرتے چلیں کہ ہمارے عہد نے مشتاق احمد یوسفی کی قدر افزائی کرنے میں کسی غیر منصفانہ فعل اور کسی ایسے بخل سے کام نہیں لیا' جس پر آئندہ نسلوں کے سامنے ہمیں شرمندہ ہونا پڑے حکومت اور عوام دونوں نے مشتاق احمد یوسفی کے جیتے جی ان کے دستِ فن شناس پر بیعت کی ہے۔ کسی سچے ادیب کی عظمت کا یہ بھی ایک ادنیٰ ثبوت خیال کرنا چاہیے۔

☆☆☆

حواشی

(۱) زیر نظر مقالے میں دی جانے والی معلومات، مقالہ نگار نے مشتاق احمد یوسفی سے ۱۱/اپریل ۱۹۹۵ء بروز منگل صبح گیارہ بجے سے شام چار بجے تک ان کی جائے سکونت، واقع ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی کراچی میں کیے گئے ایک انٹرویو سے حاصل کیں۔ نیز ان تمام حقائق کی مزید تفصیلات جاننے کے لیے ملاحظہ ہو تصنیف: "یوسفیات"، مصنف: طارق حبیب، اسلام آباد، دوست پبلی کیشنز، موسم اشاعت: ۲۰۰۳ء

(۲) راجستھان کا مطلب ہے، "راجاؤں کی رہائش"، یا "راجاؤں کی سرزمین۔"

(۳) یہ اس لیے کہ مشتاق احمد یوسفی کے علاوہ معروف محقق حافظ محمود شیرانی، معروف گلوکار مہدی حسن، میرا بائی، ریشماں وغیرہ کا تعلق بنیادی طور پر راجستھان ہی سے ہے۔

(۴) انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا، جلد ۹، صفحہ ۹۰۸ سے حاصل کی گئی معلومات۔

(۵) 'ٹونک' ہندی زبان سے ہے، جس کے معنی 'نوک دار پہاڑی' کے ہیں۔

(۶) اردو "دائرہ معارف اسلامیہ"، لاہور، پنجاب، یونیورسٹی، (تا ۔۔۔۔الشور) جلد: ۶، طبع اول: ۱۹۶۲ء/ ۱۳۸۱ھ، صفحہ: ۹۷۱ تا ۹۷۳، سے حاصل کی گئیں معلومات۔

(۷) مشتاق احمد یوسفی سے محولہ بالا انٹرویو کے ذریعے سے مقالہ نگار کی حاصل کردہ معلومات۔

(۸) مشتاق احمد یوسفی سے محولہ بالا انٹرویو کے ذریعے سے مقالہ نگار کی حاصل کردہ معلومات۔

(۹) مشتاق احمد یوسفی، بہ حوالہ: مصاحبہ، بہ تاریخ: ۱۱/اپریل ۱۹۹۵ء، بہ مقام: کراچی

(۱۰) محولہ بالا انٹرویو سے حاصل کردہ معلومات۔

(۱۱) مشتاق احمد یوسفی، بہ حوالہ: مصاحبہ، بہ تاریخ: ۱۱/اپریل ۱۹۹۵ء، بہ مقام: کراچی۔

(۱۲) مفروضہ (Hypothesis) ہے کہ مشتاق احمد یوسفی کے دادا، ملنگ خان اپنی ملازمت کے دوران میں جب اجمیر شریف میں رہے ہوں گے، تب ہی ان کی ملاقات مشتاق احمد یوسفی کے نانا احمد بخش سے ہوئی ہوگی اور ان کا تعلق آپس میں اس درجہ بڑھ گیا ہوگا کہ وہ آپس میں سمدھی بنے ہوں گے اور اپنے بچوں (عبدالکریم خان یوسفی اور مسعود جہاں) کا رشتہ آپس میں طے کیا ہوگا۔ (مقالہ نگار)

(۱۳) محمد اصغر شیخ، "مشتاق احمد یوسفی: بحیثیت مزاح نگار"، مقالہ برائے ایم اے اردو، ملتان، بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی، ۱۹۸۴ء

(۱۴) مشتاق احمد یوسفی، بہ حوالہ: مصاحبہ، بہ تاریخ: ۱۱/اپریل ۱۹۹۵ء، بہ مقام: کراچی۔

(۱۵) مشتاق احمد یوسفی، انٹرویو، مونی حسن ہفت روزہ "آج کل" لاہور، شمارہ: پہلا، جلد: ۱، ۱ تا ۷ ستمبر ۱۹۹۴ء، ص: ۲۴

(۱۶) مشتاق احمد یوسفی، "چراغ تلے"، کراچی، مکتبہ دانیال، اشاعت ہشتم: مئی ۱۹۹۳ء ص: ۱۰

(۱۷) مشتاق احمد یوسفی، ''زرگزشت''، کراچی، مکتبہ دانیال، اشاعت ہشتم: نومبر ۱۹۹۳ء ص: ۱۵

(۱۸) مشتاق احمد یوسفی، بہ حوالہ: مصاحبہ، بہ تاریخ: ۱۱راپریل ۱۹۹۵ء، بہ مقام: کراچی

(۱۹) مشتاق احمد یوسفی، ''زرگزشت''، ص: ۱۵

(۲۰) ابوالنصر محمد خالدی ایم اے (عثمانیہ)، مرتب: ''تقویم ہجری وعیسوی''، دہلی، انجمن ترقی اردو (ہند)، مارچ: ۱۹۷۷

(۲۱) ضیاء الدین لاہوری، ''جوہر تقویم''، لاہور ادارہ ثقافت اسلامیہ طبع اوّل: ۱۹۹۴ء، ص: ۲۱۷

(۲۲) فخر النساء، ''رشید احمد صدیقی اور مشتاق احمد یوسفی کا تقابلی جائزہ''، مقالہ برائے ایم اے اردو، لاہور، اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۹۰ء

(۲۳) طارق رشید، ''آب گم: تنقیدی مطالعہ''، مقالہ برائے ایم اے اردو، ملتان، زکریا یونیورسٹی، ۱۹۹۲ء، ص: ۳

(۲۴) محمد اصغر شیخ، ''مشتاق احمد یوسفی: بحیثیت مزاح نگار''، مقالہ برائے ایم اے اردو، ملتان، بہاؤ الدین زکریا یونیورسٹی، ۱۹۸۴ء

(۲۵) نمراہ اکرم، ''آب گم، تشبیہ وفرہنگ''، مقالہ برائے ایم اے اردو، سرگودھا، یونیورسٹی آف سرگودھا، ۲۰۰۳ء۔ ۲۰۰۵ء، ص: ۵

(۲۶) مشتاق احمد یوسفی، ''خاکم بدہن''، کراچی، مکتبہ دانیال، اشاعت یازدھم: مئی ۱۹۹۳ء، ص: ۱۳

(۲۷) مشتاق احمد یوسفی، بہ حوالہ: مصاحبہ، بہ تاریخ: ۱۱راپریل ۱۹۹۵ء، بمقام: کراچی۔

(۲۸) ستوانسا۔ (ست۔واں۔سا) (ہندی، اسم مذکر):

الف: وہ بچہ جو سات مہینے بعد پیدا ہوا ہو۔

ب: وہ رسم جو حمل کے ساتویں مہینے ادا کی جاتی ہے۔

(۲۹) مشتاق احمد یوسفی، بہ حوالہ: مصاحبہ، بہ تاریخ: ۱۱راپریل ۱۹۹۵ء، بمقام: کراچی

(۳۰) مشتاق احمد یوسفی سے محولہ بالا انٹرویو کے ذریعے سے مقالہ نگار کی حاصل کردہ معلومات۔

(۳۱) قبل ازیں ''یوسفیات'' کے صفحہ نمبر: ۲۹ پر انکار کا جو نتیجہ ''مذہب کی کوئی باقاعدہ تعلیم نہ تھی'' کو بنیاد بنا کر ہم نے اخذ کیا تھا، وہ درست دکھائی نہیں دیتا۔ (مقالہ نگار)

(۳۲) ''زرگزشت'' کے صفحہ: ۶۲ پر غلام احمد پرویز کے حوالے سے جو خفی سا اشارہ دیا گیا ہے وہ تنقیدی لحاظ سے تو بہت اہم ہے ہی، لیکن یوسفی صاحب کے ضبط اور ظرف کو سمجھنے میں بھی بے حد معاون ثابت ہوسکتا ہے، زندگی نے وفا کی، تو اس حوالے سے ایک علیحدہ مضمون قلم بند کیا جائے گا۔ (مقالہ نگار)

(۳۳) مشتاق احمد یوسفی، ''بہ حوالہ: مصاحبہ، بہ تاریخ: ۱۱راپریل ۱۹۹۵ء، بمقام: کراچی

(۳۴) مشتاق احمد یوسفی، ''زرگزشت''، ص: ۱۶

(۳۵) مشتاق احمد یوسفی، ''بہ حوالہ: مصاحبہ، بہ تاریخ: ۱۱راپریل ۱۹۹۵ء، بمقام: کراچی

(۳۶) ایضاً۔ نیز یہ ساری معلومات ''زرگزشت'' میں موجود ہیں، صرف معاملہ یہ ہے کہ کہیں بات زیادہ شوخ ہے اور

کہیں مزاح یا شگفتگی کے ہلکے چھلکے انداز میں۔ لیکن یوسفی صاحب کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ ''زرگزشت'' میں کوئی غلط بیانی نہیں کی گئی۔ بہ حوالہ: ''یوسفیات''، ص ۳۱ (مقالہ نگار)

(۳۷) اس وقت صرف مسلم کمرشل بینک کے ساتھ "The" لگتا تھا۔

(۳۸) مشتاق احمد یوسفی سے محولہ بالا انٹرویو کے ذریعے سے مقالہ نگار کی حاصل کردہ معلومات۔

(۳۹) گمان غالب ہے کہ اس نقل مکانی کے پس منظر میں جنرل ضیاء الحق کے دور آمریت کا کچھ نہ کچھ عمل دخل ضرور ہے۔ وضاحت کے لئے 'آب گم' کا مقدمہ: 'غنودیم غنودیم' ملاحظہ فرمایئے۔

(۴۰) انسائیکلوپیڈیا ''فیروز سنز'' اردو، لاہور، تیسرا ایڈیشن: ۱۹۸۴ء، ص: ۹۲۸

(۴۱) چوں کہ مشتاق احمد یوسفی کے ننہال کا تعلق 'بیاور' سے تھا اس لئے یہ امکان بھی سامنے رکھنا چاہئے کہ ادریس فاطمہ کے خاندان سے ان کی پہلے سے کوئی قرابت داری ہو، یا پھر ننہال کی وجہ سے کوئی رشتہ قائم ہوا ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ جن دنوں ان کے دادا ملنگ خان آگرہ میں ملازمت کرتے رہے ہوں، ان کا کوئی تعلق منظور احمد خان کے خاندان سے پیدا ہوا ہو اور ہو سکتا ہے، یہ سب اتفاق محض ہو اور ادریس فاطمہ سے ان کا اپنا تعلق مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تعلیم کے دوران میں استوار ہوا ہو۔ بہر حال ان سب امکانات سے کوئی لازمی نتیجہ برآمد کرنے پر اصرار نہیں رخش تخیل دوڑانے کا ایک مقصد تو یہ ہے کہ شاید کوئی وجدانی (قیاسی) تحقیق درست ثابت ہو اور دوسرا مقصد یہ کہ: لہو گرم کا ہے اک بہانہ

(۴۲) مشتاق احمد یوسفی سے محولہ بالا انٹرویو کے ذریعے سے مقالہ نگار کی حاصل کردہ معلومات۔

(۴۳) ''زرگزشت'' کا باب 'کوئی قلزم، کوئی دریا، کوئی قطرہ مدد دے' بطور خاص ملاحظہ ہو۔

(۴۴) Member of Royal College of Physicians

(۴۵) تفصیل جاننے کے لئے مقالہ نگار کی کتاب ''یوسفیات'' کے صفحات ۳۴ تا ۳۶ ملاحظہ ہوں۔

(۴۶) مشتاق احمد یوسفی کی اقامتوں کی تفصیل جاننے کے لئے ''یوسفیات'' کے صفحہ نمبر: ۳۶ کا مطالعہ کیجئے۔

(۴۷) مشتاق احمد یوسفی سے محولہ بالا انٹرویو کے ذریعے سے مقالہ نگار کی حاصل کردہ معلومات

(۴۸) بحوالہ: ''آج کل' ہفت روزہ، لاہور، ستمبر ۱۹۹۴ء، ص: ۲۴

(۴۹) تفصیل جاننے کے لئے ''یوسفیات'' کے صفحات ۳۷، ۳۸ ملاحظہ فرمایئے۔

(۵۰) مشتاق احمد یوسفی، 'بہ حوالہ: مصاحبہ، بہ تاریخ: ۱۱ر اپریل ۱۹۹۵ء، بمقام: کراچی

(۵۱) معین نظامی، صاحب زادہ طویل غزل، مشمولہ: ''جادہ پیما''، علمی و ادبی مجلہ، سرگودھا، گورنمنٹ انبالہ مسلم کالج، شمارہ نمبر: ۷، سال ۱۹۹۹ء تا ۲۰۰۱ء، ص: ۱۴۹

(۵۲) ایسی متاثر کن شخصیات کا کسی خاص سطح پر معروف و مشہور ہونا کچھ ضروری نہیں، بلکہ یہ شخصیات انسان کے آس پاس بسنے والی معمولی سماجی حیثیتوں کی حامل بھی ہو سکتی ہیں۔ (مقالہ نگار)

(۵۳) مشتاق احمد یوسفی، 'بہ حوالہ: مصاحبہ، بہ تاریخ: ۱۱ر اپریل ۱۹۹۵ء، بمقام: کراچی

(۵۴) مشتاق احمد یوسفی، ''آج کل'' ہفت روزہ، لاہور، انٹرویو، مونی حسن، ص: ۳۴

(۵۵) مشتاق احمد یوسفی، ''بہ حوالہ: مصاحبہ، بہ تاریخ: ۱۱/اپریل ۱۹۹۵ء، بمقام: کراچی

(۵۶) اثرات کے ضمن میں مزید تفصیل جاننے کے لیے مقالہ نگار کی کتاب ''یوسفیات'' دیکھیے۔

(۵۷) حوالہ: ثمرہ اکرم، ''آب گم کا فرہنگ تجشیہ'' یونیورسٹی آف سرگودھا ۲۰۰۵ ص: ۳۴

(۵۸) مشتاق احمد یوسفی، ''بہ حوالہ: مصاحبہ، بہ تاریخ: ۱۱/اپریل ۱۹۹۵ء، بمقام: کراچی

(۵۹) یہ نام رکھنے میں ایک پورا علمی پس منظر بھی ہے اور لطیف تر طنز کا پہلو بھی نمایاں ہے۔ (مقالہ نگار)

(۶۰) مشتاق احمد یوسفی، ''بہ حوالہ: مصاحبہ، بہ تاریخ: ۱۱/اپریل ۱۹۹۵ء، بمقام: کراچی

(۶۱) غالباً انہی مورتیوں کا ''آب گم'' میں بدھ ازم کی بحث کے دوران میں ذکر کیا گیا ہے۔

(۶۲) دیکھیے کیسی اہم بات ہے کہ مشتاق احمد یوسفی کے حوالے سے دلاور خان کا نام اور ذکر بھی محفوظ ہو گیا ورنہ آپ خود سوچیے کہ دلاور خان کی فی نفسہ کیا پہچان ہے! اور دلاور خان کی بات چھوڑیے، خود ہماری مثال آپ سب کے سامنے ہے۔ (مقالہ نگار)

(۶۳) حوری نورانی پبلشر مکتبہ دانیال واقع صدر کراچی سے ۱۱/اپریل ۱۹۹۵ء کی ایک ملاقات۔

(۶۴) کرنل محمد خان مرحوم کا مصنف کے نام ۷/اپریل ۱۹۹۵ء کو لکھا گیا خط۔

(۶۵) مسرت علی صدیقی صاحب کا خط بنام محمد اصغر شیخ، مقالہ محولہ بالا، زکریا یونیورسٹی ملتان، ص: ۱۰/۲۵

(۶۶) سید ضمیر جعفری، مشمولہ: ''مشتاق احمد یوسفی چراغ تلے سے آب گم تک''، اشاعت اول ص ۸۴ تا ۸۹

(۶۷) شان الحق حقی، مشمولہ: ایضاً محولہ بالا ص: ۹۱

(۶۸) مشتاق احمد یوسفی، ''آب گم'' کراچی، مکتبہ دانیال، اشاعت اول: فروری ۱۹۹۰ ص: ۵۴

(۶۹) دیکھیے، ''زرگزشت'' ص: ۴۴

(۷۰) مشتاق احمد یوسفی، ''سے محولہ انٹرویو کے ذریعے سے مقالہ نگار کی حاصل کردہ معلومات۔

(۷۱) مشتاق احمد یوسفی، ''بہ حوالہ: مصاحبہ، بہ تاریخ: ۱۱/اپریل ۱۹۹۵ء، بمقام: کراچی

(۷۲) پہلا مضمون ماہنامہ ''سویرا'' کے ۲۳ویں شمارے میں شائع ہوا۔ ''چارپائی اور کلچر'' ۲۷ ویں ''کرکٹ'' سویرا کے ۲۹ویں ''کاغذی ہے پیرہن'' ۳۷ویں شمارے میں شائع ہوا۔

(۷۳) بہ حوالہ: ''نصرت''، لاہور ہفت روزہ، مدیر: حنیف رامے، عبدالقدیر رشک، جلد: ۸ شمارہ: ۲۷/جون ۱۹۵۹ء

(۷۴) اس وقت ماہنامہ ''افکار'' کراچی سے صہبا لکھنوی مرحوم کی ادارت میں شائع ہوا کرتا تھا، اس کے ۹۳/۹۲ ویں، اور ۱۰۴ نمبر شمارے میں یہ مضامین شائع ہوئے۔

(۷۵) ''ادبی دنیا''، ادبی سیریز، لاہور مدیر: مولانا صلاح الدین، حوالہ ندارد۔

(۷۶) ''فنون'' سہ ماہی، لاہور مدیر: احمد ندیم قاسمی، شمارہ: ۱/۲، جلد: ۵، اکتوبر/نومبر: ۱۹۶۴

(۷۷) روز نامہ ''جنگ'' کراچی کے ادبی ایڈیشن کی اشاعتیں ۱۵/ جولائی ۱۹۸۴، ۲۳/جولائی ۲۹/جولائی، ۵،

ر اگست ،۱۲ر اگست اور ۱۹ر اگست ۱۹۸۴ء کی تاریخوں میں ہوئی۔

(۷۸) صہبا لکھنوی مرحوم ایڈیٹر ''افکار'' نے بتایا کہ ''چراغ تلے'' نام انہوں نے تجویز کیا تھا لیکن کوئی شہادت نہیں مل سکی ،خود مشتاق احمد یوسفی صاحب نے بھی تائید نہیں فرمائی ۔(مقالہ نگار)

(۷۹) مسرت علی صدیقی شاعر ہیں اور مسرت علی سرور کے نام سے ان کا شعری مجموعہ: ''نوائے بے نوا'' مکتبہ دانیال (کراچی) کے تحت چھپ چکا ہے جس میں مشتاق احمد یوسفی پر تین عمدہ نظمیں موجود ہیں ،'یوسفیات' میں ان کی ایک نظم یوسفی صاحب کی شخصیت پر بحث کرتے ہوئے شامل کی گئی ہے۔میاں فضل حسن مرحوم ہو چکے، ان کا بنیادی تعلق چنیوٹ سے تھا ،سکونت البتہ کراچی میں تھی ،ادب ان کی پہچان نہیں اور انہیں اس کی ضرورت بھی نہیں ،کیوں کہ ان کا عمدہ انسان ہونا اور مشتاق احمد یوسفی جیسی شخصیت کو متاثر کرنے کا اعزاز ہی ان کو دیر تک زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے۔(مقالہ نگار)

(۸۰) مشتاق احمد یوسفی ،'' بہ حوالہ: مصاحبہ ،بہ تاریخ: ۱۱ر اپریل ۱۹۹۵ء ،بمقام: کراچی

(۸۱) اس بات کی وضاحت کے لیے زیر نظر کتاب میں سید ضمیر جعفری کا مضمون ملاحظہ ہو۔

(۸۲) مشتاق احمد یوسفی سے بحوالہ بالا انٹرویو کے ذریعے سے مقالہ نگار کی حاصل کردہ معلومات ۔

(۸۳) ۲۳ر مارچ ۲۰۰۲ء کو پاکستان ٹیلی ویژن اسلام آباد سنٹر سے یہ تقریب نشر کی گئی ،جس میں فوجی افسران اور غیر فوجی شخصیات کو مختلف ایوارڈ اور اعزازات سے نوازا گیا۔ یہ اعزازات اس وقت کے صدر پاکستان (چیف آف دی آرمی جنرل پرویز مشرف) نے تقسیم کیے۔(مقالہ نگار)

اقوالِ یوسفی

طنز و مزاح

* وار ذرا اوچھا پڑے، یا بس ایک روایتی آنچ کی کسر رہ جائے تو لوگ اسے بالعموم طنز سے تعبیر کرتے ہیں، ورنہ مزاح

ہاتھ آئے تو بت، ہاتھ نہ آئے تو خدا

(چراغ تلے)

* سادہ و پرکار طنز ہے بڑی جان جوکھوں کا کام۔ بڑے بڑوں کے جی چھوٹ جاتے ہیں۔ اچھے طنز نگار تنے ہوئے رسّے پر اترا اترا کر کرتب نہیں دکھاتے بلکہ

رقص یہ لوگ کیا کرتے ہیں تلواروں پر

(چراغ تلے)

* عمل مزاح اپنے لہو کی آگ میں تپ کر نکھرنے کا نام ہے۔ لکڑی جل کر کوئلہ بن جاتی ہے اور کوئلہ راکھ۔ لیکن اگر کوئلے کے اندر کی آگ باہر کی آگ سے تیز ہو تو پھر وہ راکھ نہیں بنتا، ہیرا بن جاتا ہے۔ (چراغ تلے)

* ہنسنے کی آزادی فی نفسہٖ تقریر کی آزادی سے کہیں زیادہ مقدم و مقدس ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ جو قوم اپنے آپ پر جی کھول

کر ہنس سکتی ہے وہ کبھی غلام نہیں ہو سکتی۔ (چراغ تلے)

★ اختصار ظرافت اور زنانہ لباس کی جان ہے۔ (چراغ تلے)

★ مزاح نگار کے لیے نصیحت، فضیحت اور فہمائش حرام ہیں۔ وہ اپنے اور تلخ حقائق کے درمیان ایک قدِ آدم دیوارِ قہقہہ کھڑی کر لیتا ہے۔ وہ اپنا روئے خنداں سورج مکھی پھول کی مانند، ہمیشہ سرچشمۂ نور کی جانب رکھتا ہے اور جب اس کا سورج ڈوب جاتا ہے تو اپنا رخ اس سمت کر لیتا ہے، جدھر سے وہ پھر طلوع ہوگا۔ (خاکم بدہن)

★ حسِ مزاح ہی دراصل انسان کی چھٹی حس ہے۔ یہ ہو تو انسان ہر مقام سے بہ آسانی گزر جاتا ہے۔

بے نشہ کس کو طاقتِ آشوبِ آگہی

(خاکم بدہن)

★ مزاح، مذہب اور الکحل ہر چیز میں بآسانی حل ہو جاتے ہیں۔ (خاکم بدہن)

★ مزاح نگار اس وقت تک تبسمِ زیرِ لب کا سزاوار نہیں، جب تک اس نے دنیا اور اہلِ دنیا سے رج کے پیار نہ کیا ہو۔ (خاکم بدہن)

٭ طعن و تشنیع سے اگر دوسروں کی اصلاح ہو جاتی تو بارود ایجاد کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ (خاکم بدہن)

٭ مزاح نگار کو جو کچھ کہنا ہوتا ہے وہ ہنسی ہنسی میں اس طرح کہہ جاتا ہے کہ سننے والے کو بھی بہت بعد میں خبر ہوتی ہے۔ میں نے کبھی کسی پختہ کار مولوی یا مزاح نگار کو محض تقریر و تحریر کی پاداش میں جیل جاتے نہیں دیکھا۔ (زرگزشت)

٭ مزاح کی میٹھی مار بھی شوخ آنکھ، پر کار عورت اور دلیر کے وار کی طرح کبھی خالی نہیں جاتی۔ (زرگزشت)

٭ قہقہوں سے قلعوں کی دیواریں شق نہیں ہوا کرتیں چٹنی اور اچار لاکھ چٹخارے دار سہی، لیکن ان سے بھوکے کا پیٹ نہیں بھرا جاسکتا۔ نہ سراب سے مسافر کی پیاس بجھتی ہے۔ ہاں، ریگستان کے شدائد کم ہو جاتے ہیں۔ (زرگزشت)

٭ ماورائے تبسم وہ اہتزاز اور مزاح جو سچائی اور دانائی سے عاری ہے۔ دریدہ دہنی، پھکڑ پن اور ٹھٹھول سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا، زر، زن، زمین اور زبان کی دنیا یک رخوں، یک چشموں کی دنیا ہے۔ مگر تتلی کی سینکڑوں آنکھیں ہوتی ہیں اور وہ ان سب کی مجموعی مدد سے دیکھتی ہے۔ شگفتہ نگار بھی اپنے پورے وجود سے سب کچھ دیکھتا، سنتا، سہتا اور سہارتا چلا جاتا ہے اور فضا میں

اپنے سارے رنگ بکھیر کے کسی نئے افق کسی اور شفق کی تلاش میں گم ہو جاتا ہے۔ (زرگزشت)

* قدیم زمانے میں چین میں یہ دستور تھا کہ جس شخص کا مذاق اُڑانا مقصود ہوتا، اس کی ناک پر سفیدی پوت دیتے تھے۔ پھر وہ دکھیا کتنی بھی گمبھیر بات کہتا، کلاؤن ہی لگتا تھا۔ کم و بیش یہی حشر مزاح نگار کا ہوتا ہے۔ (آبِ گم)

* قنوطیت غالباً مزاح نگاروں کا مقدر ہے۔ (آبِ گم)

* مزاح کو میں دفائی میکے نزم سمجھتا ہوں۔ یہ تلوار نہیں، اس شخص کا زرہ بکتر ہے جو شدید زخمی ہونے کے بعد اسے پہن لیتا ہے۔ (آبِ گم)

ادب

٭ شبلی نے عمرِ طبعی کے خلاف جہاد کر کے ثابت کر دیا کہ عشق عطیہ قدرت ہے۔ (چراغ تلے)

٭ وہ (اختر شیرانی) وصل کی اس طور پر فرمائش کرتا ہے گویا بچہ ٹافی مانگ رہا ہے۔ (خاکم بدہن)

٭ اس ظالم (ہوش خلیج آبادی) کے تقاضائے وصل کے یہ تیور ہیں گویا کوئی پٹھان ڈانٹ ڈپٹ کر ڈوبی ہوئی رقم وصول کر رہا ہے۔ (خاکم بدہن)

٭ فانی مصورِ غم ہیں، تو مہدی مصور بنتِ عم۔ (خاکم بدہن)

٭ ان (مولانا ابوالکلام آزاد) کی نثر کا مطالعہ ایسا ہے جیسے دلدل میں تیرنا۔ (خاکم بدہن)

٭ مولانا (ابوالکلام آزاد) کا مشروب بھی ان کے مشرب کی مانند تھا، ٹوٹے ہوئے بتوں کو جوڑ جوڑ کر امام الہند نے ایسا معبود تراشنے کی کوشش کی جو اہلِ سومنات کو بھی قابلِ قبول ہو۔ (خاکم بدہن)

★ رہے ابوالکلام آزاد سو وہ اپنی انا کے قتیل تھے۔ اسلام میں اگر انسان کو سجدہ روا ہوتا تو وہ اپنے آپ کو سجدہ کرتے۔ (زرگزشت)

★ بچھو کا کاٹا روتا اور سانپ کا کاٹا سوتا ہے۔ انشا جی کا کاٹا سوتے میں مسکراتا ہے۔ (زرگزشت)

★ مولانا ابوالکلام آزاد تو نثر کا آرائشی فریم صرف پسندیدہ فارسی اشعار ٹانگنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ان کے اشعار بے محل نہیں ہوتے، ملحقہ نثر بے محل ہوتی ہے۔ وہ اپنی نثر کا تمام تر ریشمی کوکون (کویا) اپنے گاڑھے گاڑھے لعابِ ذہن سے فارسی شعر کے گرد بُنتے ہیں۔ (آبِ گم)

★ کلامِ غالب کی سب سے بڑی مشکل اس کی شرحیں ہیں، وہ نہ ہوں تو غالب کا سمجھنا چنداں مشکل نہیں۔ (آبِ گم)

★ دنیا میں غالب واحد شاعر ہے جو سمجھ میں نہ آئے تو دگنا مزا دیتا ہے۔ (آبِ گم)

★ آزاد شاعری کی مثال ایسی ہے جیسے بغیر نیٹ کے ٹینس کھیلنا۔ (آبِ گم)

* آغا حشر کے مکالمے حجلۂ عروسی میں بھی خود اور زرہ بکتر پہنے، برہنہ تلوار لہراتے داخل ہوتے ہیں جبکہ میدانِ جنگ میں ان کا ہر قدم نقارے پر پڑتا ہے۔ (آبِ گم)

* ہمارے خیال میں آدمی کو آدمی ڈھونے کی اجازت صرف دو صورتوں میں ملنی چاہیے، اول اس موقعے پر جب دونوں میں سے ایک وفات پا چکا ہو۔ دوسرے اس صورت میں جب دونوں میں سے ایک اردو نقاد ہو جس پر مردے ڈھونا فرض ہی نہیں ذریعۂ معاش اور وجۂ شہرت بھی ہو۔ (آبِ گم)

* کلامِ داغ آسمانِ فصاحت سے اُترا، کوٹھے پہ اٹکا، وہاں سے پھسلا تو کولھے پہ آکے مٹکا۔ (آبِ گم)

* شعر کتنا ہی لغو اور کمزور کیوں نہ ہو، اسے بقلم خود کاٹنا اور حذف کرنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا اپنی اولاد کو بدصورت کہنا یا زنبور سے اپنا ہلتا ہوا دانت خود اُکھاڑنا۔ (آبِ گم)

* حقیقت نگاری کے پردے میں جتنی داد طوائف کو اردو فکشن لکھنے والوں سے ملی اتنی اپنے شبینہ گاہکوں سے بھی نہ ملی ہوگی۔ (آبِ گم)

عورت

* سبز بہ سبز تازہ تازہ اور کرارے کرنسی نوٹوں کا عطر نکال کر ملازمت پیشہ حضرات اور ان کی بیویوں کو مہینے کی آخری تاریخوں کو سنگھایا جائے تو گرہستی زندگی جنت کا نمونہ بن جائے۔ (چراغ تلے)

* بیوی کو پیرس ڈھو کر لے جانا ایسا ہی ہے جیسے کوئی ایورسٹ سر کرنے نکلے اور تھرماس میں گھر سے برف کی ڈلی رکھ کر لے جائے۔ (خاکم بدہن)

* مرد کی آنکھ اور عورت کی زبان کا دم سب سے آخر میں نکلتا ہے۔ (خاکم بدہن)

* پہاڑ اور ادھیڑ عورت دراصل آئل پینٹنگ کی طرح ہوتے ہیں۔ انھیں ذرا فاصلے سے دیکھنا چاہیے۔ (خاکم بدہن)

* ۳۵ تک پہنچتے پہنچتے عورت مصری SPHINX (ابوالہول) ہو جاتی ہے۔ چہرہ عورت کا اور دھڑ وغیرہ شیرِ ببر کا۔ (زرگزشت)

★ تنگ دستی نہ ہو تو تندرست آدمی کی تمنا کا دوسرا قدم گرہستی حدود کے باہر پڑتا ہے۔ (زرگزشت)

★ عورت کی ایڑی ہٹاؤ تو اس کے نیچے سے کسی نہ کسی مرد کی ناک ضرور نکلے گی۔ (زرگزشت)

★ گھوڑے اور عورت کی ذات کا اندازہ اس کی لات اور بات سے کیا جاتا ہے۔ (چراغ تلے)

★ دراصل گرہستی زندگی کی آب و ہوا ہی ایسی معتدل ہے کہ مولسری کا پھول دو تین سال میں گوبھی کا پھول بن جائے تو عجب نہیں۔ (چراغ تلے)

★ زلیخا حضرت یوسف کے پیچھے دوڑنے کی وجہ سے دوبارہ جوان ہوئی۔ (چراغ تلے)

★ قلوپطرہ کے نازک اندام ہونے کا راز یہ ہے کہ وہ نہار منہ مصری تربوز کا پانی اور رعیت کا خون پیتی تھی۔ (چراغ تلے)

★ ملکہ ممتاز محل اور تاج محل کی خوبصورتی کا راز ایک ہی ہے ---سفید رنگ۔ (چراغ تلے)

* مرد کی پسند وہ پل صراط ہے جس پر کوئی موٹی عورت نہیں چل سکتی ۔ (چراغ تلے)

* یوروپ کی اور ہماری خواتین میں بڑا فرق ہے ۔ یوروپ میں جو لڑکی دور سے سترہ برس کی معلوم ہوتی ہے وہ قریب پہنچ کر ستر برس کی نکلتی ہے اور ہمارے ہاں جو خاتون دور سے ستر برس کی دکھائی پڑتی ہے وہ نزدیک آنے پر سترہ برس کی نکلتی ہے ۔ (خاکم بدہن)

* گانے والی کی صورت اچھی ہو تو مہمل شعر کا مطلب بھی سمجھ میں آجاتا ہے ۔ (خاکم بدہن)

ناسٹلجیا

* اپنے ماضی سے شیفتگی رکھنے والوں کی مثال ایک ایسی مخلوق کی سی ہے جس کی آنکھیں گدی کے پیچھے لگی ہوتی ہیں۔
(چراغ تلے)

* اپنا تو عقیدہ ہے کہ جسے ماضی یاد نہیں رہتا اس کی زندگی میں شاید کبھی کچھ ہوا ہی نہیں، لیکن جو اپنے ماضی کو یاد ہی نہیں کرنا چاہتا وہ یقیناً لوفر رہا ہوگا۔ (چراغ تلے)

* جینا ہے تو پھسلتے، سرسراتے لمحے کو دانتوں سے پکڑو، گزرتے لمحے کو بے جھجک چھاتی سے لگاؤ کہ اس کی نس نس میں ماضی کا نیم گرم خون دوڑ رہا ہے۔ اسی کی جیتی جیتی کوکھ سے مستقبل جنم لے گا اور اپنی چھل بل دکھا کر آخر اسی کی طرف لوٹے گا۔
(چراغ تلے)

* جو قوم جتنی پسماندہ، درماندہ اور پست حوصلہ ہو، اس کو اپنا ماضی، معکوس اقلیدسی تناسب (Inverse geometrical ratio) میں، اتنا ہی زیادہ درخشاں اور دہرائے جانے کے لائق نظر آتا ہے۔ (آبِ گم)

★ پیری میں پرانی ضرب المثل کے مطابق صد عیب ہوں یا نہ ہوں، ایک عیب ضرور ہے جو سو عیبوں پر بھاری ہے اور وہ ہے ناسٹلجیا۔ (آبِ گم)

★ پیری میں ماضی اپنی تمام مہلک رعنائیوں کے ساتھ جاگ اُٹھتا ہے۔ (آبِ گم)

★ بوڑھے آدمی کے حال کی سب سے بڑی خرابی اس کا ماضی ہوتا ہے، جو بھلائے نہیں بھولتا۔ (آبِ گم)

جانور

★ انسان کتے کا بہترین رفیق ہے۔ (چراغ تلے)

★ مسلمان ہمیشہ سے ایک عملی قوم رہے ہیں اور وہ کسی ایسے جانور کو محبت سے نہیں پالتے جسے ذبح کر کے کھا نہ سکیں۔
(چراغ تلے)

★ آپ نے کبھی غور کیا کہ دوسرے جانوروں کے مقابلے میں مرغ کی آواز، اس کی جسامت کے لحاظ سے کم از کم سو گنا زیادہ ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر گھوڑے کی آواز اسی مناسبت سے بنائی گئی ہوتی تو تاریخی جنگوں میں توپ چلانے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ (چراغ تلے)

★ جس گھر کتا ہو، اس گھر میں چور ہی نہیں، رحمت کے فرشتے بھی داخل نہیں ہو سکتے۔ (خاکم بدہن)

★ ہر وہ جانور جسے مسلمان کھا سکتے ہیں، پاک ہے۔
(خاکم بدہن)

★ جو شخص کتے سے بھی نہ ڈرے، مجھے اس کی ولدیت میں شبہ ہے۔ (خاکم بدہن)

* کتے میں سے اگر جبڑا نکال دیا جائے تو خاصا معقول جانور ہے۔ (خاکم بدہن)

* بندر میں ہمیں اس کے علاوہ اور کوئی عیب نظر نہیں آتا کہ وہ انسان کا جدِ اعلیٰ ہے۔ (زرگزشت)

* بھونکنا کتے کا حق اور دُم ہلانا اس کا فرض ہے۔ (زرگزشت)

* پالتو جانور کی چپ دسراتھ اور اس کا پیار کتنا بھرپور ہوتا ہے۔اس کا اندازہ اسی وقت ہوتا ہے جب آدمی دکھی ہو یا تنہا۔ (زرگزشت)

* شیر کو پنجرے میں قید کر دو، تب بھی شیر ہی رہتا ہے۔گیدڑ کو کچھار میں آزاد چھوڑ دو اور زیادہ گیدڑ ہو جائے گا۔ (آب گم)

* کوّے پر کتنے ہی صدمے گزر جائیں، کتنا ہی بوڑھا ہو جائے، اس کے پر و بال کالے ہی رہتے ہیں۔ (آب گم)

* جانوروں میں کتا اور گھوڑا انسان کے سب سے پہلے اور پکے رفیق ہیں۔جنہوں نے اس کی خاطر ہمیشہ کے لیے جنگل چھوڑا۔ (آب گم)

* آقا کے سامنے بے اختیار ہلنے والی کتے کی دم پچھلے جنم میں کسی مصاحب کی زبان تھی۔ کتا اس کام کے لیے اپنی زبان استعمال نہیں کرتا۔ (آبِ گم)

* عمرِ طبعی تک تو صرف کوّے، کچھوے، گدھ، گدھے اور وہ جانور پہنچتے ہیں جن کا کھانا شرعاً حرام ہے۔ (آبِ گم)

* گھوڑے کی ٹانگوں کا استعمال صرف دو صورتوں میں جائز ہے۔ اول میدانِ جنگ میں دشمن پر تیز رفتاری سے حملہ کرنے کے لیے دوم حملہ ناکام ہو تو میدانِ جنگ سے دگنی تیز رفتاری سے بھاگنے کے لیے۔ (آبِ گم)

کراچی

* اہل کراچی اس واللہ اعلم بالصواب قسم کے موسم کے اس قدر عادی ہو گئے ہیں کہ اگر یہ دو تین گھنٹے تبدیل نہ ہو تو وحشت ہونے لگتی ہے۔ (چراغ تلے)

* بدلتے ہوئے موسم کے اس گنجان کاروباری شہر میں مچھلی اور مہمان پہلے ہی دن بدبو دینے لگتے ہیں۔ (چراغ تلے)

* اگر کوئی جھوٹوں بھی اُڑا دے کہ لاہور میں اولے پڑے ہیں تو زندہ دلان کراچی فوراً سر منڈا لیتے ہیں۔
(چراغ تلے)

* سچ تو یہ ہے کہ کراچی میں طبیعت کے سوا کوئی چیز ہری نہیں ہوتی۔ (چراغ تلے)

* ہم نے تو سوچا تھا کراچی چھوٹا سا جہنم ہے، جہنم تو بڑا سا کراچی نکلا۔ (آبِ گم)

* کراچی کی ہوا میں اتنی رطوبت اور دلوں میں اتنی رقت ہے کہ کھلے میں ہاتھ پھیلا کر اور آنکھیں موند کر کھڑے ہو جاؤ تو پانچ منٹ میں چلو بھر پانی اور ہتھیلی بھر پیسے جمع ہو جائیں گے اور

اگر چھ منٹ تک ہاتھ پھیلائے اور آنکھیں موندے رہو تو پیسے غائب ہو جائیں گے۔(آبِ گم)

★ یہاں (کراچی) بال، سائی لینسر اور لچھن قبل از وقت جھڑ جاتے ہیں۔(آبِ گم)

★ کراچی کی پانچ چیزوں کا کم از کم اس دنیا میں تو جواب نہیں، جڑاؤ زیورات، قوالی، بریانی، گالی اور عود کا عطر۔(آبِ گم)

★ کراچی میں ادھار پر بزنس بیوپار کرنا ایسا ہی ہے جیسے کماد (گنّے) کے کھیت میں کبڈی کھیلنا! جتنا بڑا شہر ہوگا اتنا ہی بڑا گھپلا اور پھڈا ہوگا۔ جس کی چھت زیادہ بڑی ہے اس پر برف بھی زیادہ گرے گی۔(آبِ گم)

متفرقات

آنکھ کا نشہ

★ سب سے باؤلا نشہ آنکھ کا نشہ ہوتا ہے اور سب سے گندہ گناہ آنکھ کا گناہ ہے۔ (آبِ گم)

Solo Performance

★ ہمارے ہاں ناچ گانا، حکمرانی اور مشاعرہ اکل کھرے فن ہیں۔ ان کا سارا مزہ اور بنیاد ہی Solo Performance پر ہے۔ اسی لیے سیاست میں نعرے اور جلوس اور مشاعرے میں داد اور ہوٹنگ ہماری ضرورت، روایت اور سیفٹی والو بن گئے۔
(آبِ گم)

طب اور طوائف

★ طب اور طوائف ہمارے ہاں بدقسمتی سے لازم و ۔۔۔ملزومہ ہیں۔ (آبِ گم)

ذکرِ گناہ

★ ذکرِ گناہ، عملِ گناہ سے کہیں زیادہ لذیذ ہوسکتا ہے۔ بشرطیکہ طویل ہو اور راوی جسمانی اور معنوی دونوں لحاظ سے ضعیف ہو۔ (آبِ گم)

گفتگو کی بنیاد

* ہماری گائیکی کی بنیاد طبلے پر ہے۔ گفتگو کی بنیاد گالی پر۔
(آبِ گم)

شہادتِ جاریہ

* کچھ برگزیدہ شہید ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی آزمائش، عقوبتِ مطہرہ اور شہادتِ عظمیٰ ان کی موت کے ساتھ ختم نہیں ہوتی۔ ربِ جلیل انھیں شہادتِ جاریہ کی سعادت سے سرفراز فرماتا ہے۔ (آبِ گم)

اجنبی

* گاؤں میں اجنبی کی آمد کا اعلان کتے، مور اور بچے کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ سارے گاؤں اور ہر گھر کا مہمان بن جاتا ہے۔ (آبِ گم)

ٹھاٹ

* کبھی اپنے کسی بزرگ یا باس یا اپنے سے کم بد معاش آدمی کی اصلاح کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ انھیں غلط راہ پر دیکھو تو تین دانا بندروں کی طرح اندھے، بہرے اور گونگے بن جاؤ۔ ٹھاٹ کروگے۔ (آبِ گم)

دروغ مصلحت آمیز

★ تمام عمر دروغ مصلحت آمیز کے ساتھ ہنسی خوشی گزارہ کرنے کے بعد قبر میں پہنچ کر اور کفن پھاڑ کر سچ بولنے اور منہ چڑانے کی کوشش کرنا مردوں ہی کو نہیں مُردوں کو بھی زیب نہیں دیتا۔ (آبِ گم)

لمحے کی سچائی

★ ہر لمحے کی اپنی سچائی اور اپنی صلیب اور اپنا تاج ہوتا ہے۔ اس سچائی کا اعلان و ابلاغ بھی صرف اسی اور صرف اسی لمحے واجب ہوتا ہے۔ سو جو چپ رہا اس نے اس لمحے سے اور اپنے آپ سے کیسی دغا کی۔ (آبِ گم)

آسمان

★ جس آسمان پر کبوتر، شفق، پتنگ اور ستارے نہ ہوں ایسے آسمان کی طرف نظر اٹھا کے دیکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ (آبِ گم)

شوق کی پہچان

★ سچے شوق اور ہابی کی پہچان یہ ہے کہ بالکل فضول اور بے مصرف ہو۔ (آبِ گم)

ٹوٹی لاٹھی

٭ ہزار لاٹھی ٹوٹی ہو، پھر بھی گھر بھر کے برتن باسن توڑنے کو بہت ہے۔ (آبِ گم)

بے کہی بیوی

٭ بڑھاپے میں نئی روشنی کی بے کہی بیوی سے نباہ کرنا اسے قابو میں رکھنا بڑا مشکل کام ہے۔ (آبِ گم)

بے حس اور نکما

٭ جب آدمی اپنے کام پر فخر کرنا چھوڑ دے تو وہ بہت جلد بے حس اور نکما ہو جاتا ہے۔ پھر وہ اپنے کام کو بھی سچ مچ ذلیل اور گھٹیا بنا دیتا ہے۔ (آبِ گم)

مرد کا نابینا ہونا

٭ محبت اندھی ہوتی ہے۔ چنانچہ عورت کے لیے خوبصورت ہونا ضروری نہیں، بس مرد کا نابینا ہونا کافی ہووے ہے۔ (آبِ گم)

نخالص قِسم

٭ بے سبب دشمنی اور بدصورت عورت سے عشق حقیقت میں دشمنی اور عشق کی سب سے نخالص قِسم ہے۔ کس واسطے کہ یہ شروع ہی وہاں سے ہوویں ہیں جہاں عقل ختم ہو جاوے ہے۔ (آبِ گم)

آسمانی دلیل

٭ مسلمان لڑکے حساب میں فیل ہونے کو اپنے مسلمان ہونے کی آسمانی دلیل سمجھتے ہیں۔ (آبِ گم)

گنتی کے سانس

٭ بعض سادھوؤں اور جوگیوں کا عقیدہ ہے کہ ہر انسان کے مقدر میں بھگوان نے گنتی کے سانس لکھے ہیں۔ چنانچہ بیشتر وقت سانس روکے بیٹھے رہتے ہیں تاکہ زندگی بقدرِ حبس دم لمبی ہو جائے۔ طوعاً وکرہاً گنڈے دار سانس فقط اس لیے لے لیتے ہیں کہ اسے روک سکیں۔ (آبِ گم)

اچھا استاد

٭ اچھے استاد کے اندر ایک بچہ بیٹھا ہوتا ہے جو ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر اور سر ہلا ہلا کر بتاتا جاتا ہے کہ بات سمجھ میں آئی کہ نہیں۔
(آبِ گم)

پروفیسر

★ اپنے ہاں جو لڑکے پڑھائی میں پھسڈی ہوتے ہیں وہ فوج میں چلے جاتے ہیں اور جو فوج کے لیے Medically unfit ہوتے ہیں وہ کالجوں میں پروفیسر بن جاتے ہیں۔
(آبِ گم)

نظر کا مول

★ مشرق کی ہزاروں سال پرانی ریت ہے کہ پانی، نصیحت اور تعلیم کا پیسہ نہیں لیا جاتا، پیسہ لے لو تو یہ انگ نہیں لگتے اور انجام کار پیسہ بھی نہیں بچتا۔ آج تک ایسا نہیں ہوا کہ معاوضہ دے کر حاصل کیے ہوئے علم سے کوئی روحانی تبدیلی آئی ہو۔ سچی تبدیلی صرف کسی کی نظر سے آتی ہے اور نظر کا کوئی مول نہیں۔ (آبِ گم)

گدھے کی سواری

★ سواری سے نفس موٹا ہوتا ہے، سوائے گدھے کی سواری کے، اسی لیے بنی اسرائیل کے پیغمبروں نے گدھے کی سواری کی ہے۔ (آبِ گم)

وقت

★ صاحب! فاصلے کو گز سے نہیں، وقت سے ناپنا چاہیے۔
(آبِ گم)

نر و مادہ

* پرندوں، چھپکلیوں، مچھلیوں، Punks اور اردو الفاظ میں نر و مادہ کی تمیز کرنا انسان کے بس کا کام نہیں۔ (آبِ گم)

ہم عمر بڈھے

* اپنے ہم عمر بڈھوں سے محض ہاتھ ملانے سے آدمی کی زندگی ہر مصافحے کے بعد ایک سال گھٹ جاتی ہے۔ (آبِ گم)

کلا کا سہاگ

* ہر پہاڑ کو کوئی نہ کوئی تیشہ بردار فرہاد مل جاتا ہے۔ کلا کا سہاگ بھی کبھی اُجڑا ہے۔ اس کی مانگ تو سدا سیندور اور ستاروں سے بھری رہے گی۔ (آبِ گم)

نمرتا

* ہندو رشوت لینے میں بھی ایسی نمرتا (انکسار) ایسا اخلاق اور اعتدال برتتا ہے کہ واللہ دوبارہ دینے کو جی چاہتا ہے۔ (آبِ گم)

افورڈ

* صاحب آپ راشی، زانی اور شرابی کو ہمیشہ خوش اخلاق، ملنسار اور میٹھا پائیں گے۔ اس واسطے کہ وہ نخوت، سخت گیری اور بدمزاجی افورڈ ہی نہیں کر سکتا۔ (آبِ گم)

مادری زبان

* گالی، گنتی، سرگوشی اور گندہ لطیفہ تو اپنی مادری زبان میں ہی مزہ دیتا ہے۔(آبِ گم)

مڈل کلاس غریبی

* مڈل کلاس غریبی کی سب سے قابلِ رحم اور لا علاج قسم وہ ہے جس میں آدمی کے پاس کچھ نہ ہو لیکن اسے کسی چیز کی کمی محسوس نہ ہو۔(آبِ گم)

نر آدمی کی للکار

* پشتو منت وزاری اور فریاد وفغاں کی زبان نہیں، نر آدمی کی للکار ہے۔(آبِ گم)

ہارا ہوا مرغا

* ہارا ہوا مرغا کھانے سے آدمی اتنا بودا ہو جاتا ہے کہ حکومت کی ہر بات درست معلوم ہونے لگتی ہے۔(آبِ گم)

بیتا سمے

* اصل رونا جغرافیہ کا نہیں جوانی اور بیتے سمے کا ہے جو آبِ حیاتِ امروز میں زہر گھول دیتا ہے۔(آبِ گم)

بارہ سنگھا

★ بارہ سنگھا ماں کے پیٹ سے سینگوں کے جھاڑ سمیت پیدا نہیں ہوتا۔ (آبِ گم)

سچار

★ اِترا اِترا کے لکھنے والے کو لکھار اور کھل کھیلنے والی کو کھِلاڑ کہتے ہیں بالکل اسی طرح بات بے بات سچ بولنے والے کو سندھی میں ''سچار'' کہتے ہیں۔ (آبِ گم)

ایڑی میں آنکھیں

★ جوان لڑکی کی ایڑی میں بھی آنکھیں ہوتی ہیں۔ وہ چلتی ہے تو اسے پتہ ہوتا ہے کہ پیچھے کون کیسی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ (آبِ گم)

دشمنی اور انتقام

★ دشمنی اور انتقام کے بغیر مرد کی زندگی بے مقصد لا حاصل اور مہمل ہو کر رہ جاتی ہے۔ (آبِ گم)

جنگل کی خوشبو

★ جس آدمی کو جنگل کی خوشبو آتی اور بھاتی رہے وہ کبھی کسی کی غلامی اور محکومی قبول نہیں کرے گا۔ (آبِ گم)

لفظوں کی جنگ

★ لفظوں کی جنگ میں فتح کسی بھی فریق کی ہو شہید صرف سچائی ہوتی ہے۔ (آبِ گم)

دل پر رقم

★ خود زندگی جو کچھ دکھاتی، سکھاتی اور پڑھاتی ہے وہ سیدھا دل پر رقم ہوتا ہے۔ (آبِ گم)

جھنجھلاہٹ

★ خواری کا اصل سبب سمجھ میں آجائے تو جھنجھلاہٹ جاتی رہتی ہے۔ پھر انسان کو چپ لگ جاتی ہے۔ (آبِ گم)

اوچھی پونجی، منحوس سواری

★ اوچھی پونجی بیوپاری کو اور منحوس سواری مالک کو کھا جاتی ہے۔ (آبِ گم)

خطائے نسواں

★ انسان خطائے نسواں کا پتلا ہے۔ (آبِ گم)

نجر نجرانہ

* کبھی انکم ٹیکس آفیسر، پولیس، جوان جورو اور پیر فقیر کے پاس جاؤ تو سولجر کی مافک کھالی ہاتھ ہلاتے، ڈبل مارچ کرتے نئیں جاؤ، ہمیشہ کوئی ڈالی، کچھ مال پانی، کچھ نجر نجرانہ لے کے جاؤ۔ (آبِ گم)

ریورس گیئر

* شیر، ہوائی جہاز، گولی، ٹرک اور پٹھان ریورس گیئر میں چل ہی نہیں سکتے۔ (آبِ گم)

غرض مند

* غرض مند صرف آئینے کا منہ چِڑا سکتا ہے۔ (آبِ گم)

جوان جورو

* آنکھوں گوڈوں میں پانی اُتر آئے تو معجون اور چمپی مالش کارگر نہیں ہوتی۔ پھر تو لاٹھی بیساکھی چاہیے یا جوان جورو۔ (آبِ گم)

باون گز کا مینار

٭ ہم نے باون گز گہرے ایسے اندھے کنویں بھی دیکھے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ وہ خود کو اوندھا دیں یعنی سر کے بل اُلٹے کھڑے ہو جائیں تو باون گز کا مینار بن جائیں گے۔ (آبِ گم)

ڈاکٹروں کا حصہ

٭ پرائیوٹ اسپتال اور کلینک میں مرنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ مرحوم کی جائداد، جمع جتھا اور بینک بیلینس کے بٹوارے پر پسماندگان میں خون خرابا نہیں ہوتا کیونکہ وہ سب ڈاکٹروں کے حصے میں آجاتے ہیں۔ (آبِ گم)

دخل

٭ ایک عمر ایسی آتی ہے جب انسان دوسروں کے کاموں میں دخل دینے ہی کو اپنا عمل شمار کرنے لگتا ہے۔ (آبِ گم)

سچ

٭ فی زمانہ ۱۰۰ فی صد سچ بول کر زندگی کرنا ایسا ہی ہے جیسے بجری ملائے بغیر، صرف سیمنٹ سے مکان بنانا۔ (آبِ گم)

ذلیل وخوار

★ سچ بول کر ذلیل وخوار ہونے کی بہ نسبت جھوٹ بول کر ذلیل وخوار ہونا بہتر ہے۔ آدمی کو کم از کم صبر تو آجاتا ہے کہ کس بات کی سزا مل رہی ہے۔ (آبِ گم)

شاہوں کا نالہ

★ شاہوں کا نالہ پابندِ لے ہی نہیں، پابندِ نے بھی نہیں ہوتا۔ (آبِ گم)

لقمۂ تر

★ بھائی میرے! بخشتا کوئی نہیں، ہم سب ایک دوسرے کا ازوقہ ہیں۔ بڑے جتن سے ایک دوسرے کو چیرتے پھاڑتے ہیں
تب نظر آتی ہے اک لقمۂ تر کی صورت
(آبِ گم)

دلہن اور جانور

★ شریف گھرانوں میں آئی ہوئی دلہن اور جانور تو مر کر ہی نکلتے ہیں۔ (آبِ گم)

بے توقیر

★ سبکی ، بے وقری اور ذلت کی سب سے ذلیل صورت یہ ہے کہ آدمی خود اپنی نظر میں بے وقعت و بے توقیر ہو جائے ۔
(آبِ گم)

عقل میں فتور

★ جب شیر اور بکری ایک ہی گھاٹ پانی پینے لگیں تو سمجھ لو کہ شیر کی نیت اور بکری کی عقل میں فتور ہے ۔ (آب گم)

ڈی مور یلائز

★ جب غیور اور با اصول آدمی حتی القدور دھکے کھانے کے بعد ''ڈی مور یلائز'' ہو کر کامیاب لوگوں کے ہتھکنڈے اپنانے کی بھونڈی کوشش کرتا ہے تو رہی سہی بات اور بگڑ جاتی ہے ۔ (آب گم)

گھوڑا

★ جو شخص گھوڑے پر نہیں بیٹھتا ، وہ کبھی سیر چشم ، غیور اور شیر دلیر نہیں ہو سکتا ۔ (آب گم)

پیسے

★ جس دن بچے کی جیب سے فضول چیزوں کے بجائے ، پیسے برآمد ہوں تو سمجھ لینا چاہیے کہ اب اسے بے فکری کی نیند کبھی نصیب نہیں ہوگی ۔ (آبِ گم)

دل پسند سواری

* بادشاہوں اور مطلق العنان حکمرانوں کی مستقل اور دل پسند سواری در حقیقت رعایا ہوتی ہے۔ یہ ایک دفعہ اس پر سواری گانٹھ لیں تو پھر انھیں سامنے کوئی کنواں، کھائی، باڑھ اور رکاوٹ دکھائی نہیں دیتی۔ جوشِ شہ زوری و شہ سواری میں نوشتۂ دیوار والی دیوار بھی پھلانگ جاتے ہیں۔ (آبِ گم)

دُم

* سب سے اعلیٰ و افضل وہ دُم قرار پائے گی جو جھڑ چکی ہے۔ اس لیے کہ اس حادثے کے بعد ہی اشرف المخلوقات اور خلیفۃ الارض کا درجہ ملا ہے۔ (آبِ گم)

دل میں زہر

* انسان واحد حیوان ہے جو اپنا زہر دل میں رکھتا ہے۔ (آبِ گم)

جان کی امان

* بعض اوقات غریب کو مونچھ صرف اس لیے رکھنی پڑتی ہے کہ بوقتِ ضرورت نیچی کر کے جان کی امان پائے۔ (آبِ گم)

خوابِ نیم روز اور فینٹسی

★ خوابِ نیم روز (Day dreaming) اور فینٹسی سے دو ہی صورتوں میں چھٹکارا مل سکتا ہے۔ اول جب وہ فینٹسی نہ رہے، حقیقت بن جائے۔ دوم، انسان کسی چوراہے بلکہ شش و پنج راہے پر اپنے سوتے جاگتے ہمزاد سے سارے خواب بخشوا کر رخصت چاہے۔ (آبِ گم)

اُداسی

★ غصّہ جتنا کم ہوگا، اس کی جگہ اُداسی لیتی چلی جائے گی۔ (آبِ گم)

دوڑتا ہوا درخت

★ میں وہ درخت ہوں جو ٹرین میں جاتے ہوئے مسافر کو دوڑتا ہوا نظر آتا ہے۔ (آبِ گم)

منافق، ریاکار

★ الحمد اللہ! میں منافق، ریاکار نہیں میں نے گناہ کو ہمیشہ گناہ سمجھ کر کیا۔ (آبِ گم)

لفظوں کے بندر

* ہر زمانے کا اپنا اسلوب اور آہنگ ہوتا ہے۔ لفظ کبھی انگرکھا، کبھی عبا و عمامہ، کبھی ڈنر جیکٹ یا فولس کیپ، کبھی پیر میں پائل یا بیڑی پہنے نظر آتے ہیں اور کبھی کوئی مداری اپنی قاموسی ڈگڈگی بجاتا ہے تو لفظوں کے سدھے سدھائے بندر ناچنے لگتے ہیں۔ (آبِ گم)

پردہ

* کمبوہ مرد اور غزل گو شاعر سے پردہ لازم ہے خواہ مُردہ ہی کیوں نہ ہو۔ (آبِ گم)

جڑیں

* جب آدمی کو یہ نہ معلوم ہو کہ اس کی نال کہاں گڑی ہے اور پرکھوں کی ہڈیاں کہاں دفن ہیں تو وہ منی پلانٹ کی طرح ہو جاتا ہے۔ جو مٹی کے بغیر صرف بوتلوں میں پھلتا پھولتا ہے۔
(آبِ گم)

ہاتھ پھیرو

* یہ بات ہم نے شیشم کی لکڑی، کانسی کی لٹیا، بالی عمریا اور چگی داڑھی میں ہی دیکھی کہ جتنا ہاتھ پھیرو اتنی ہی چمکتی ہے۔
(آبِ گم)

دیسی فرنیچر

★ یورپین فرنیچر صرف بیٹھنے کے لیے ہوتا ہے، جب کہ ہم کسی ایسی چیز پر بیٹھتے ہی نہیں جس پر لیٹ نہ سکیں۔ مثال میں دری ،گدیلے، قالین، جازم، چاندنی، چارپائی، کوچۂ یار اور پہلوئے دلدار کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ (آبِ گم)

نابالغوں کے شغل

★ میٹھا پان، ٹھمری اور ناول، یہ سب نابالغوں کے شغل ہیں۔ (آبِ گم)

راجستھان کے تین تحفے

★ راجستھان کے تین طرفہ تحفوں کے تو ہم بھی قائل اور گھائل ہیں۔ میرا بائی، مہدی حسن اور ریشماں۔ (آبِ گم)

دل اور جوانی

★ داغ تو دو ہی چیزوں پر سجتا ہے۔ دل اور جوانی۔
(آبِ گم)

ذہنی سکون اور بے فکری

* زندگی اور کیرئیر میں دو چیزوں کی بڑی اہمیت ہے۔ اوّل عزت دوم ذہنی سکون اور بے فکری۔ (آبِ گم)

زندگی کا راز

* ہر دکھ، ہر عذاب کے بعد زندگی، آدمی پر اپنا ایک راز کھول دیتی ہے۔ (آبِ گم)

دکھ

* ہر شخص کے ذہن میں عیش و فراغت کا ایک نقشہ ہوتا ہے جو دراصل چربہ ہوتا ہے، اس ٹھاٹ باٹ کا جو دوسروں کے حصّے میں آیا ہے۔ لیکن جو دکھ آدمی سہتا ہے وہ تنہا اس کا اپنا ہوتا ہے۔ (آبِ گم)

یادوں کے فانوس

* بوڑھا اور تنہا آدمی ایک ایسے کھنڈر میں رہتا ہے جہاں بھری دوپہر میں چراغاں ہوتا ہے اور جب روشنیاں بجھا کے سونے کا وقت آتا ہے تو یادوں کے فانوس جگمگ جگمگ روشن ہوتے چلے جاتے ہیں۔ (آبِ گم)

رومانی ہالہ

* ماضی ہر شے کے گرد ایک رومانی ہالہ کھینچ دیتا ہے۔ گزرا ہوا درد بھی سہانا لگتا ہے۔ (آبِ گم)

مست ملنگ

* آدمی کا جب سب کچھ چھن جائے تو وہ یا تو مست ملنگ ہو جاتا ہے یا کسی فینٹسی لینڈ میں پناہ لیتا ہے۔ (آبِ گم)

آدمی

* آدمی اتنا ہی تنہا ہوتا ہے جتنا محسوس کرتا ہے۔

(آبِ گم)

اُلجھن

* مرض کا نام معلوم ہو جائے تو تکلیف تو دور نہیں ہوتی، اُلجھن دور ہو جاتی ہے۔ (آبِ گم)

ڈِھلمل

* جب کوئی شخص دوسروں کو قائل کرنے کے لیے زور شور سے فلسفہ اور منطق بگھارنے لگے تو سمجھ جایئے کہ اندر سے وہ بچارا خود ڈِھلمل ہے۔ (آبِ گم)

بن مانگے مشورے

٭ انسان کا کوئی کام بگڑ جائے تو ناکامی سے اتنی کوفت نہیں ہوتی جتنی ان بن مانگے مشوروں اور نصیحتوں سے ہوتی ہے جن سے ہر وہ شخص نوازتا ہے جس نے کبھی اس کام کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ (آبِ گم)

ذکرِ گناہ

٭ ذکرِ گناہ، عمل گناہ سے کہیں زیادہ لذیذ ہوتا ہے۔
(آبِ گم)

سب سے نمایاں

٭ جہاں سبھی تاج پہنے بیٹھے ہوں، وہاں ننگے سر، خاک بسر آدمی سب سے نمایاں ہوتا ہے۔ (آبِ گم)

چار گھنٹے

٭ تھانے، حوالات یا جیل میں آدمی چار گھنٹے بھی گزار لے تو زندگی اور حضرتِ انسان کے بارے میں اتنا کچھ سیکھ لے گا کہ یونیورسٹی میں چالیس برس رہ کر بھی نہیں سیکھ سکتا۔ (آبِ گم)

معلّم

★ اچھا معلم ہونے کے لیے عالم ہونے کی شرط نہیں ہے۔۔
(آبِ گم)

لہجہ

★ دلوں کے قفل کی کلید لفظ میں نہیں لہجے میں ہوتی ہے۔
(آبِ گم)

مایوس ہونے کا فائدہ

★ قبل از وقت مایوس ہو جانے میں ایک فائدہ یہ دیکھا کہ ناکامی اور صدمے کا ڈنک اور ڈر پہلے ہی نکل جاتا ہے۔ (آبِ گم)

بوڑھا

★ جب انسان کو ماضی حال سے زیادہ پُرکشش نظر آنے لگے اور مستقبل نظر آنا ہی بند ہو جائے تو باور کرنا چاہیے کہ وہ بوڑھا ہو گیا ہے۔ (آبِ گم)

Rarity

★ بدصورت انگریز عورت Rarity (نایاب) ہے۔ بڑی مشکل سے نظر آتی ہے۔ (آبِ گم)

پب اور بار

* شائستگی، رواداری اور برد باری میں انگریزوں کا جواب نہیں۔ مذہب، سیاست اور سیکس پر کسی اور کیسی بھی محفل میں گفتگو کرنا خلافِ تہذیب اور انتہائی معیوب سمجھتے ہیں۔ سوائے پب (شراب خانہ) اور بار کے۔ (آبِ گم)

پاکستان

* پاکستان کی افواہوں کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ سچ نکلتی ہیں۔ (آبِ گم)

اُجڑا گھر

* جس گھر میں ایک دفعہ طبلہ یا گھنگھرو بج گئے، اس گھر کے سامنے ایک نہ ایک دن دوالے اور قرقی کا ڈھول بجنا لازمی ہے۔ وہ گھر اُجڑے ہی اُجڑے۔ (آبِ گم)

جاڑا

* جاڑے اور بڑھاپے کو جتنا محسوس کرو گے اتنا ہی لگتا چلا جائے گا۔ (زرگزشت)

تہمت

* ایک عمر ایسی بھی آتی ہے کہ آدمی کو تہمت سے بھی یک گونہ خوشی حاصل ہوتی ہے۔(زرگزشت)

نری بدمعاشی

* مرد عشق و عاشقی صرف ایک ہی مرتبہ کرتا ہے، دوسری مرتبہ عیاشی اور اس کے بعد نری بدمعاشی ۔(زرگزشت)

پان

* آدمی کو کھانا اپنی بیوی کے ہاتھ کا پچتا ہے اور پان پرائی کے ہاتھ کا رچتا ہے۔(زرگزشت)

محاورے

* محاورے زبان کے بڑھے ہوئے ناخن ہوتے ہیں ۔
(زرگزشت)

نشہ اور سوانح حیات

* نشہ اور سوانح حیات میں جو نہ کھلے ،اس سے ڈرنا چاہیے۔(زرگزشت)

خوش دلی

* خوش دلی کی ایک منزل بے حسی سے پہلے پڑتی ہے اور ایک اس کے بعد۔ (زرگزشت)

شرابی

* خالی بوری اور شرابی کو کون کھڑا رکھ سکتا ہے۔
(زرگزشت)

کتاب

* کتاب خوب صورت بیوی کی طرح ہوتی ہے۔ دور سے کھڑے کھڑے دیکھ کر داد دینے کے لیے، بغل میں دبا کر لے جانے کے لیے نہیں۔ (زرگزشت)

سور کے چمڑے کی ڈائری

* سود، شراب، اپنے افسروں کی تاریخ پیدائش اور جوئے کی ہار جیت کا حساب رکھنے کے لیے سور کے چمڑے کی ڈائری سے بہتر اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ (زرگزشت)

آم

* آم اگر پہلے ترش نہ ہو تو پھر کبھی میٹھا نہیں ہو سکتا۔
(زرگزشت)

بچپن کے کھلونے

★ بچپن کے کھلونے ٹوٹتے ٹوٹتے ہی ٹوٹتے ہیں۔
(زرگزشت)

دھیرج

★ زمین میں ذرا سا سوراخ کرنا ہوتو پوری طاقت سے کدال چلانی پڑتی ہے۔ لیکن خاک بسر بیج، کومل اکھوے اور نرم و نازک پنیری کس دھیرج سے اسی زمین کو ایک ادا سے رضا مند کر کے نکل آتے ہیں۔ (زرگزشت)

روپ بہروپ

★ جس نے ایک بار گوشت پوشت کا روپ بہروپ دیکھ لیا اس کی تسکین پھر کبھی پرچھائیوں سے نہیں ہوگی۔ (زرگزشت)

چیل، کیل، وکیل

★ آسمان کی چیل، چوکھٹ کی کیل اور کورٹ کے وکیل سے خدا بچائے، ننگا کر کے چھوڑتے ہیں۔ (زرگزشت)

مونچھ اور سگار

★ مونچھ اور سگار کے بغیر پیار کیسا ادھورا ادھورا، پھیکا، شیر خوار لگتا ہے۔(زرگزشت)

ایجاد

★ تاش کے جتنے بھی کھیل ہیں وہ مردوں نے ایک دوسرے کو چپ رکھنے کے لیے ایجاد کیے ہیں۔(زرگزشت)

آسمانی کشش

★ ۱۹۵۲ء کے بعد سے زمین کی کشش ہر چیز کو نیچے کھینچتی ہے، سوائے قیمتوں ، پاکستانی بیورو کریٹ کے سر اور ماڈرن Bra کے مشمولات کے جو فی زمانہ صرف آسمانی کشش کے تابع ہیں۔(زرگزشت)

بو باس

★ گھونسے ،چٹکی ، چھڑی ، گنڈاسے اور بندوق کی چوٹ ایک جیسی نہیں ہوتی ۔ ہر ملک کے پھول ،ہر دیس کی ناری کی بو باس جُدا ہوتی ہے۔(زرگزشت)

کم حرام

★ شراب کو ڈرنکس کہا جائے تو کم حرام معلوم ہوتی ہے۔

(زرگزشت)

طرزِ تعزیر

★ الزاموں کی نوعیت بدلتی رہی ہے، مگر زمانے کا طرزِ تعزیر آج بھی وہی ہے۔ (زرگزشت)

جوتا

★ جوتا ایسی چیز نہیں کہ زیور کی طرح مانگ تانگ کر پہن لیا جائے۔ (زرگزشت)

دھرتی

★ دھرتی اپنا آپا اور بھید بھاؤ جوتے کے تلے کو نہیں دکھایا کرتی۔ (زرگزشت)

گاف

★ امریکن تینوں گاف یعنی گفتگو، گانا، اور گالی ناک سے ادا وعطا کرتے ہیں۔ (زرگزشت)

گرمی

* گرمی کھائی ہوئی روٹی اور لڑکی کا کون لیوال ہوتا ہے۔
(زرگزشت)

لچھن

* ایجاد اور اولاد کے لچھن پہلے ہی سے معلوم ہو جایا کرتے تو دنیا میں نہ کوئی بچہ ہونے دیتا اور نہ ایجاد۔ (زرگزشت)

قبر کھودنے والا

* قبر کھودنے والا ہر میت پر آنسو بہانے بیٹھ جائے تو روتے روتے اندھا ہو جائے۔ (زرگزشت)

جب ذرا گردن نکالی دیکھ لی

* یہ میکینزم قدرت نے صرف کچھوے ہی میں رکھا ہے کہ ذرا کوئی چیز ناگوارِ خاطر ہوئی اور سٹ سے گردن اندر کر لی۔ بصورتِ دیگر جب ذرا گردن نکالی دیکھ لی۔ (زرگزشت)

موٹی کھال

* لمبی عمر کا راز دراصل نیند، موٹی کھال اور Slow living میں مضمر ہے۔ (زرگزشت)

ائیر کریش

* بحری جہاز کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس کا ائیر کریش نہیں ہوتا۔
(زرگزشت)

مذاق

* ہمارے یہاں مذاق کانے کا اڑایا جاتا ہے، اندھے کو اندھا اور نائی کو نائی نہیں کہتے، حافظ جی اور خلیفہ کہتے ہیں۔
(زرگزشت)

انٹلکچول

* پاکستانی بزنس مین، بیوروکریٹ اور بینکر کی ڈکشنری میں ''انٹلکچول'' سے زیادہ بڑی گالی کوئی نہیں۔ (زرگزشت)

آنکھیں

* فقیر کے لیے آنکھیں نہ ہونا بڑی نعمت ہے۔
(زرگزشت)

آوارگی

* مونگ پھلی اور آوارگی میں خرابی یہ ہے کہ آدمی ایک دفعہ شروع کر دے تو سمجھ میں نہیں آتا ختم کیسے کرے۔ (زرگزشت)

تذکیر و تانیث

* تلیر اور اردو الفاظ کی تذکیر و تانیث معلوم کرنے کے لیے چھٹی حس درکار ہے۔(زرگزشت)

چالیس کا پیٹا

* چالیس کے پیٹے میں آنے کے بعد دال، کھٹائی، ہم عمروں کی صحبت اور آئینے سے پرہیز لازم ہے۔(زرگزشت)

جے پور

* آپ تو جے پور کی مشہور چیزیں صرف سانڈ، کھانڈ، بھانڈ اور رانڈ ہی بتاتے ہیں۔(زرگزشت)

رشتے دار

* دشمنوں کے، حسبِ عداوت، تین درجے ہیں دشمن، جانی دشمن اور رشتے دار۔(زرگزشت)

یک زوجیہ

* دوسرے کا ذبح کیا ہوا گوشت کھانے سے آدمی بزدلا، یک زوجیہ اور چرب زبان ہو جاتا ہے۔(زرگزشت)

شیطان کی ورک شاپ

★ خالی دماغ شیطان کی ورک شاپ ہوتا ہے۔(زرگزشت)

رس

★ بھٹے، مرغی کی ٹانگ، پیار اور گنے پر جب تک دانت نہ لگے رس پیدا نہیں ہوتا۔(زرگزشت)

بڑھاپے کی شادی

★ بڑھاپے کی شادی اور بینک کی چوکیداری میں ذرا فرق نہیں۔سوتے میں بھی ایک آنکھ کھلی رکھنی پڑتی ہے اور چھیا پہ ہاتھ رکھ کے سونا پڑتا ہے۔(زرگزشت)

قصاب

★ قصاب کہیں گوسفندوں کی کثرت سے گھبراتا ہے۔
(زرگزشت)

نسواں کا پتلا

★ انسان خطا ونسواں کا پتلا ہے۔(زرگزشت)

کامیابی کا راز

★ کامیابی کے لیے صحت، محنت، دیانت اور ذہانت ازبس ضروری ہیں۔ (زرگزشت)

روپ کی راجدھانی

★ بھلے گھرانوں میں وہ انگ جو روپ کی راجدھانی ہیں۔ کپڑے کی صنعت کے مرہون منت نہیں ہوتے۔ (زرگزشت)

کثرت وزیادتی

★ بُری بات اور بُری عادت کا صحیح لطف ولذت دراصل کثرت وزیادتی (Excess) میں ہی آتا ہے۔ صاحبو! اعتدال پر اتنا ہی اصرار ہے تو نیکی کرو۔ کون روکتا ہے۔ (زرگزشت)

سداسہاگن راگنیاں

★ یوں بھی بھیرویں اور خوشامد سداسہاگن راگنیاں ہیں۔ ہر وقت، ہر محفل اور موسم میں مزا دیتی ہیں۔ (زرگزشت)

دف

* جوانی دیوانی کا دف بیوی سے مارا جاتا ہے۔ بیوی کا دف اولاد سے مارتے ہیں اور اولاد کا سائینسی تعلیم سے، سائینسی تعلیم کا دف اپنے ہاں دینیات سے مارا جاتا ہے۔ ارے صاحب دف کا مرنا کھیل نہیں ہے مرتے مرتے مرتا ہے۔ (زرگزشت)

غیبت

* دنیا میں غیبت سے زیادہ زود ہضم کوئی چیز نہیں۔ (زرگزشت)

بجلی

* بجلی ایک ہی جگہ دوبارہ نہیں گرا کرتی۔ (زرگزشت)

جاڑا اور بڑھاپا

* جاڑے اور بڑھاپے کو جتنا زیادہ محسوس کرو اتنا ہی لگتا چلا جاتا ہے۔ (زرگزشت)

سرتاپا سپردگی

* دولت، سیاست، عورت اور عبادت، کامل یکسوئی، مکمل خودگزاشتگی، سرتاپا سپردگی چاہتی ہیں۔ ذرا دھیان بھٹکا اور منزل کھوٹی ہوئی۔ (زرگزشت)

سود اور سرطان

* سود اور سرطان کو بڑھنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔
(زرگزشت)

آدمی جاگ اُٹھے

* صبح اس وقت نہیں ہوتی جب سورج نکلتا ہے، صبح اس وقت ہوتی ہے، جب آدمی جاگ اُٹھے۔ (زرگزشت)

اِترا اِترا کر چلنا

* قومیں جب اللہ کی زمین پر اِترا اِترا کر چلنے لگتی ہیں تو زمین اپنے ہی زہر خند سے شق ہو جاتی ہے اور تہذیبیں اس میں سما جاتی ہیں۔ (زرگزشت)

اجازت کے بغیر

* دنیا میں جہاں کہیں، جو کچھ ہو رہا ہے، وہ ہماری اجازت کے بغیر ہو رہا ہے۔ (زرگزشت)

عام آدمی

* عام آدمی کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ اس کی زندگی میں صرف تین موقعے ایسے آتے ہیں جب وہ تنہا سب کی نگاہوں کا مرکز ہوتا ہے۔ عقیقہ، نکاح اور تدفین۔ (زرگزشت)

عام آدمی

* عام آدمی تو بے چارہ اتنی بھی سکت اور استطاعت نہیں رکھتا کہ اپنی زندگی کو مردم آزاری کے تین مسلّمہ ادوار میں تقسیم کر سکے یعنی جوانی میں فضیحت، ڈھلتی عمر میں نصیحت اور بڑھاپے میں وصیت۔ (زرگزشت)

حشو وزوائد

* اپنی تحریر میں کانٹ چھانٹ کرنے اور حشو وزوائد کا مسئلہ بڑا ٹیڑھا ہوتا ہے۔ یہ تو ایسا ہی عمل ہے جیسے سرجن اپنا اپنڈکس آپ نکالنے کی کوشش کرے۔ (زرگزشت)

تجارت اور نجابت

* تجارت اور نجابت میں سنجوگ ممکن نہیں۔ (خاکم بدہن)

درد واذیت کا احساس

* ہمارے ہاں عورت اور شراب کو اب تک کلوروفارم کی جگہ استعمال کیا جاتا ہے۔ یعنی درد واذیت کا احساس مٹانے کے لیے، نہ کہ سرود وانبساط کی خاطر۔ (خاکم بدہن)

نری عاشقی

* آدمی بوالہوسی میں کمزوری یا کاہلی دکھائے تو نری عاشقی رہ جاتی ہے۔(خاکم بدہن)

عمرِ وسطیٰ

* بائی فوکل، السر، بدنظری، گاف، نئی نسل سے بیزاری، رقیق القلبی اور آسودہ حالی۔ یہ عمرِ وسطیٰ کی جانی پہچانی نشانیاں ہیں۔(خاکم بدہن)

عمر

* خون، مشک، عشق اور ناجائز دولت کی طرح عمر بھی چھپائے نہیں چھپتی۔(خاکم بدہن)

کایا کا سکھ

* کایا کا سکھ چاہو تو جوانی میں بہرے بن جاؤ اور بڑھاپے میں اندھے۔ (خاکم بدہن)

جوتے

★ مسجد میں ہم کبھی عام جوتے پہن کر نہیں جاتے۔ اس لیے کہ جوتے اگر ثابت ہوں تو سجدے میں دل انھیں میں پڑا رہتا ہے۔ (خاکم بدہن)

تھوڑا سا آرام

★ مڈل ایج کا بجز پیری کوئی علاج نہیں۔ ہاں تنگ دستی اور تصوف سے تھوڑا سا آرام آجاتا ہے۔ (خاکم بدہن)

داد

★ ایک رقاصہ اپنے حسن و کمال کی داد لینے دوسری رقاصہ کے پاس نہیں جاتی۔ داد تو تماشائیوں سے ملتی ہے۔ (خاکم بدہن)

ٹھٹھیرے کا کبوتر

★ ٹھٹھیرے کا کبوتر تالیوں سے نہیں اُڑتا۔ (خاکم بدہن)

ہنرمند

★ ہنرمند کے ہاتھ میں اوزار بھی ہتھیار بن جاتا ہے۔ (خاکم بدہن)

ایک عمر کا ریاض

★ ایک متبسم خود سپردگی، ایک بے تاب آمادگی کے ساتھ مرنے کے لیے ایک عمر کا ریاض درکار ہے۔ یہ بڑے ظرف اور حوصلے کا کام ہے۔ (خاکم بدہن)

ولدیت

★ جس طرح آج کل کسی کی عمر یا تنخواہ دریافت کرنا بُری بات سمجھی جاتی ہے اسی طرح، بالکل اسی طرح بیس سال بعد کسی کی ولدیت پوچھنا بداخلاقی سمجھی جائے گی۔ (خاکم بدہن)

مانجھی

★ کنارے کو ترسا ہوا مانجھی ہر اُتھلی کھاڑی میں لنگر ڈال دیتا ہے۔ (خاکم بدہن)

زبان

★ صاحب! خدا نے ایک پارۂ گوشت کو جانے کس لذّت سے ہمکنار کر دیا۔ اگر سارا بدن اس لذّت سے آشنا ہو جاتا تو انسان اس کی تاب نہ لاتا۔ زمین کی چھاتی پھٹ جاتی۔
(خاکم بدہن)

باہر کی پیاز

* ہر شب آنگن میں اُترنے والے من وسلویٰ کے مقابلے باہر کی پیاز کی گنٹھی مزا دے جاتی ہے۔ (خاکم بدہن)

حماقت

* مرزا حماقت بھی کرتے ہیں تو اس قدر اوریجنل کہ بہ خدا الہامی معلوم ہوتی ہے۔ (خاکم بدہن)

آلو اور مذہب

* جو ملک جتنا غربت زدہ ہوگا، اتنا ہی آلو اور مذہب کا چلن زیادہ ہوگا۔ (خاکم بدہن)

شادی و طلاق

* صاحب مرد کا کیا ہے آج کل مرد زندگی سے اُکتا جاتا ہے تو شادی کر لیتا ہے اور اگر شادی شدہ ہے تو طلاق دے دیتا ہے۔ (خاکم بدہن)

انگریز عورت

* کوئی انگریز عورت جسے اپنا فگر اور مستقبل ذرا بھی عزیز ہے، آلو کو چھوتی تک نہیں۔ (خاکم بدہن)

پروفیسر

* آدمی ایک بار پروفیسر ہو جائے تو عمر بھر پروفیسر ہی رہتا ہے، خواہ بعد میں سمجھداری کی باتیں ہی کیوں نہ کرنے لگے۔
(خاکم بدہن)

تخمی آم

* انگریزی فلموں میں لوگ یوں پیار کرتے ہیں جیسے تخمی آم چوس رہے ہوں۔ (خاکم بدہن)

فی

* اگر کوئی شخص تجارت میں بہت جلد ناکام نہ ہو سکے تو سمجھ لو کہ اس کے حسب نسب میں فی ہے۔ (خاکم بدہن)

جینے کا فلسفہ

* بیسویں صدی میں جیت ان ہی کی ہے جن کے ایک ہاتھ میں دین ہے اور دوسرے میں دنیا اور دائیں ہاتھ کو خبر نہیں کہ بائیں میں کیا ہے۔ (خاکم بدہن)

جُوا

★ جُوا اگر قریبی رشتہ داروں کے ساتھ کھیلا جائے تو کم گناہ ہوتا ہے۔ (خاکم بدہن)

علم الحساب اور مسلمان

★ علم الحساب درحقیقت کسی متعصب کافر نے مسلمانوں کو آزار پہنچانے کے لیے ایجاد کیا ہے۔ (خاکم بدہن)

مصیبت

★ انسان واحد حیوان ہے جو مصیبت پڑنے سے پہلے مایوس ہو جاتا ہے۔ (خاکم بدہن)

صاحبِ معاملہ

★ خود دیباچہ لکھنے میں وہی سہولت اور فائدے مضمر ہیں جو خودکشی میں ہوتے ہیں، یعنی تاریخ وفات، آلۂ قتل اور موقع واردات کا انتخاب صاحبِ معاملہ خود کرتا ہے۔ (خاکم بدہن)

بُری صحبت

★ تفریح میں بُری صحبت سے پرہیز لازم ہے۔
(چراغ تلے)

قنوطی

★ قنوطی سے ایسا شخص مراد ہے جس کا یہ عقیدہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے آنکھیں رونے کے لیے بنائی ہیں۔ (چراغ تلے)

ہیکڑ

★ قومیں پٹ پٹ کر ہی ہیکڑ ہوتی ہیں۔ (چراغ تلے)

تعزیری مشقت

★ ہمارے ہاں کرکٹ مشغلہ ہے نہ مشن، اچھی خاصی تعزیری مشقت ہے، جس میں کام سے زیادہ عرق ریزی کرنا پڑتی ہے۔
(چراغ تلے)

تماشائی کی تالی

★ یاد رکھو! تماشے میں جان تماشائی کی تالی سے پڑتی ہے، نہ کہ مداری کی ڈگڈگی سے۔ (چراغ تلے)

تاش

* آپ تجارت اور عبادت تو کسی کے ساتھ بھی کر سکتے ہیں، لیکن تاش صرف اشرافوں کے ساتھ کھیلنے چاہئیں۔ (چراغ تلے)

جنّت

* جنّت واحد ایسی جگہ ہے جس کا حال اور مستقبل اس کے ماضی سے بہتر نہیں ہو سکتا۔ (چراغ تلے)

دانت اور چنے

* قدرت کے کھیل نرالے ہوتے ہیں۔ جب وہ دانت دیتی ہے تو چنے نہیں ہوتے اور جب چنے دینے پر آتی ہے تو دانت ندارد۔ (چراغ تلے)

گلہ

* موسم، معشوق اور حکومت کا گلہ ہمیشہ سے ہمارا قومی مشغلہ رہا ہے۔ (چراغ تلے)

تضاد

★ ان (انگریز) کی قومی خصلت ہے کہ وہ تفریح کے معاملے میں انتہائی جذباتی ہو جاتے ہیں اور معاملاتِ محبت میں پرلے درجے کے کاروباری! اسی خوش گوار تضاد کا نتیجہ ہے کہ ان کا فلسفہ حد درجہ سطحی ہے اور مزاح نہایت گہرا۔ (چراغ تلے)

بدمعاشی

★ فی زمانہ ہم تو شاعری کو جب تک کہ وہ کسی کا ذریعۂ معاش نہ ہو، نری عیاشی بلکہ بدمعاشی سمجھتے ہیں۔ (چراغ تلے)

ایک جیسی شکل

★ سچ تو یہ ہے کہ مجھے سب مُرغ، نوزائیدہ بچے اور سکھ ایک جیسی شکل کے نظر آتے ہیں۔ (چراغ تلے)

مرغ وملاّ

★ مرغ وملاّ کے رزق کی فکر تو اللہ میاں کو بھی نہیں ہوتی۔ (چراغ تلے)

چار پائی اور غریب رشتے دار

★ اونچے گھرانوں میں اب ایسی چار پائیوں کو غریب رشتہ داروں کی طرح کونوں کھدروں میں آڑے وقت کے لیے چھپا کر رکھا جاتا ہے۔(چراغ تلے)

روئی، دوئی اور منٹو کے افسانے

★ مثل مشہور ہے کہ سردی روئی سے جاتی ہے یا دوئی سے لیکن اگر یہ اسباب ناپید ہوں اور سردی زیادہ اور لحاف پتلا ہو تو غریب غربا منٹو کے افسانے پڑھ کر سو رہتے ہیں۔ (چراغ تلے)

گول میز

★ بین الاقوامی مذاکرات گول میز پر نہ ہوئے ہوتے تو لاکھوں جانیں تلف ہونے سے بچ جاتیں۔(چراغ تلے)

فرصت کے لمحات

★ کسی شخص کی شائستگی و شرافت کا اندازہ آپ صرف اس سے لگا سکتے ہیں کہ وہ فرصت کے لمحات میں کیا کرتا ہے اور رات کو کس قسم کے خواب دیکھتا ہے۔(چراغ تلے)

اعلیٰ تہذیب

* ممکن ہے عمدہ غذا اعلیٰ تہذیب کو جنم نہ دے سکے، لیکن اعلیٰ تہذیب کبھی خراب غذا برداشت نہیں کر سکتی۔ (چراغ تلے)

زندگی کی رفتار

* وقت کو انسان جتنی بار تقسیم کرے گا، زندگی کی رفتار اتنی ہی تیز اور نتیجتاً موت اتنی ہی قریب ہوتی جاتی ہے۔ (چراغ تلے)

پیری و موت کا ذائقہ

* جس شخص نے بھی ناقابلِ تقسیم رواں دواں وقت کو پہلی بار سکینڈ، سال اور صدی میں تقسیم کیا، اس نے انسان کو صحیح معنوں میں پیری اور موت کا ذائقہ چکھایا۔ (چراغ تلے)

عمر

* عمر بھی ضمیر اور جوتے کی مانند ہے، جن کی موجودگی کا احساس اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک وہ تکلیف نہ دینے لگیں۔
(چراغ تلے)

ڈھلتی چھاؤں

★ چڑھتی دوپہر سے ڈھلتی چھاؤں زیادہ خوشگوار ہوتی ہے۔(چراغ تلے)

دبے پاؤں

★ زبردست تبدیلیاں ہمیشہ دبے پاؤں آتی ہیں۔(چراغ تلے)

بڑے آدمیوں کا اعمال نامہ

★ تاریخ بڑے آدمیوں کا اعمال نامہ ہے جو غلطی سے ہمارے ہاتھ میں تھما دیا گیا۔(چراغ تلے)

بیمے کا مقصد

★ آدمی اگر قبل از وقت مر نہ سکے تو بیمے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔(چراغ تلے)

لذّت

★ کسی اچھے بھلے کام کو عیب سمجھ کر کیا جائے تو اس میں لذّت پیدا ہو جاتی ہے۔(چراغ تلے)

دانا

* دانا وہی ہے جو ذرا محنت کر کے اپنی ذات میں کوئی ایسا نمایاں عیب پیدا کر لے جو اس کے اصل عیبوں کو ڈھانپ لے۔
(چراغ تلے)

رشتہ دار

* بڑھیا سگریٹ پیتے ہی ہر شخص کو معاف کر دینے کو جی چاہتا ہے۔ خواہ وہ رشتے دار ہی کیوں نہ ہو۔ (چراغ تلے)

واہ، آہ، کراہ

* حسن اور جوانی سے بہرہ یاب ہونے کا سلیقہ بھی کچھ کچھ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب واہ ایک گہری آہ اور آہ ایک لمبی کراہ میں بدل چکی ہوتی ہے۔ (چراغ تلے)

امریکہ کی ترقی

* امریکہ کی ترقی کا سبب یہی ہے کہ اس کا کوئی ماضی نہیں۔
(چراغ تلے)

ملنگ کا دل

* ملنگ کے دل میں سبیل پر قبضہ کرنے کی خواہش نہیں ہوتی۔ (چراغ تلے)

جوان مولوی اور بوڑھا شاعر

* جوان مولوی اور بوڑھے شاعر پر اپنا دل تو نہیں ٹھکتا۔ (چراغ تلے)

اطمینان

* سچ تو یہ ہے کہ حکومتوں کے علاوہ کوئی بھی اپنی موجودہ ترقی سے مطمئن نہیں ہوتا۔ (چراغ تلے)

ترقی کی نشانی

* اپنے عہد سے غیر مطمئن ہونا بجائے خود ترقی کی نشانی ہے۔ (چراغ تلے)

کہاوت

* کافی کا جلا چائے پھونک کر پیتا ہے۔ (چراغ تلے)

تلفظ کی مجبوری

★ میں ماکولات میں معقولات کا، دخل جائز نہیں سمجھتا تاوقتیکہ اس گھپلے کی اصل وجہ تلفظ کی مجبوری نہ ہو۔(چراغ تلے)

سلیقہ

★ اپنے فلسفہ کی خاطر دوسروں کو جان دینے پر آمادہ کرنے کے لیے سلیقہ چاہیے۔(چراغ تلے)

عمدہ غذا

★ عمدہ غذا کے بعد کم از کم مجھے تو بڑا انشراح محسوس ہوتا ہے اور بے اختیار جی چاہتا ہے کہ بڑھ کے ہر راہ گیر کو سینے سے لگا لوں۔(چراغ تلے)

صحیح غذا اور غلط مشورہ

★ میں دماغی صحت کے لیے یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ انسان کو پابندی سے صحیح غذا اور غلط مشورہ ملتا رہے۔اسی سے ذہنی توازن قائم رہتا ہے۔(چراغ تلے)

مزاج پرسی

* مارفیا کے انجکشن مریض کے بجائے مزاج پرسی کرنے والوں کے لگائے جائیں تو مریض کو بہت جلد سکون آ جائے۔
(چراغ تلے)

موت اور شادی

* انسان کو موت ہمیشہ قبل از وقت اور شادی بعد از وقت معلوم ہوتی ہے۔ (چراغ تلے)

پہلا پتھر

* جس شخص کو پہلا پتھر پھینکتے وقت اپنا سر یاد نہیں رہتا، اُسے دوسروں پر پتھر پھینکنے کا حق نہیں۔ (چراغ تلے)

چادر، چاندنی، چاند بی اور کالم بھر چاندنی

زیادہ عرصہ نہیں ہوا، میں نے ایک ادبی تقریب میں اپنے خودساختہ ہینڈی کیپ کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ لوگ مزاح نگار سے کوئی سنجیدہ بات سننے کے روادار نہیں۔ چنانچہ ایک نہایت ثقہ پروفیشنل انجمن نے فرمائش کر کے مجھ سے اسلامی بینکنگ کے حق میں مزاحیہ تقریر کروائی تھی۔ ملنگوں اور مجذوبوں کے بارے میں مشہور ہے کہ اُن کی اُوٹ پٹانگ بڑ کا مطلب اہلِ غرض اپنے اپنے طور پر سمجھ کر خوش ہو جاتے ہیں۔ ہمارا شمار بھی اسی زمرۂ ذومعنی لفظ کاروں میں ہونا چاہیے۔ اُسی زمانے میں ایک تعزیتی جلسے میں نہایت سنجیدہ مضمون پڑھا جسے مزاحیہ سمجھ کر سامعین نے تالیاں بجا بجا کے داد دی، جس سے مرحوم کی روح کو تکلیف، پس ماندگان کو اذیت اور جھوٹ کیوں بولوں...... مجھے خوشی ہوئی۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ شاعر کو اپنے کمزور شعر پر غلط داد سے جتنی خوشی ہوتی ہے، اتنی خوشی اچھے شعر پر داد پانے سے نہیں ہوتی۔ اوّل الذکر تقریب میں ایک بے محل سی بات یہ بھی کہی تھی کہ مزاح نگار اور خاتون افسانہ نگار کو میں ایک ہی بریکٹ میں رکھتا ہوں۔ سبب یہ ہے کہ اگر کوئی اہلِ قلم مزاح نگار کہلانے لگے تو پھر خواہ وہ مرثیے تصنیف کرنے لگے یا اربابِ سیاست کا ''روز اک تازہ قصیدہ نئی تشبیب کے ساتھ'' ہی کیوں نہ لکھے، کہلائے گا مزاح نگار ہی۔ اسی طرح اگر کوئی لکھنے والی ایک دفعہ ''خاتون افسانہ نگار'' کی حیثیت سے متعارف اور مشہور ہو جائے تو پھر یہ لیبل چھڑائے نہیں چھٹے گا۔ اس کے فن پر جو شٹل کاک برقع مردوں نے ایک دفعہ ڈال دیا، اس کا نقاب اگر روزمرّہ استعمال یا کثرتِ رونمائی سے لیر لیر ہو جائے اور وہ خاتون سرجیکل آپریشن سے جنس تبدیل کروا کے میری ہم جنس اور نظرِ بد دور، میری ہم شکل لگنے لگے، یا اس کے اگر حضرتِ محمود شام کی سی نورانی داڑھی اور پروفیسر خٹک جیسی شباب آلود مونچھیں بھی نکل آئیں، تب بھی لوگ اُس دُکھیا کو سابق خاتون

افسانہ نگار ہی کے نام سے پکاریں گے۔ قرۃ العین حیدر اور ہاجرہ مسرور کو اگر خاتون افسانہ نگار کہا جائے تو وہ بجا طور پر برافروختہ ہوں گی، جب کہ ہمیں یا جون ایلیا کو کوئی خاتون اگر مرد شاعر کہہ دے تو کم از کم ہم تو بہت خوش ہوں گے۔

اُس وقت میرے سان گمان میں نہ تھا کہ تین برساتوں بعد ہی ایسا بجوگ پڑے گا کہ ایک مزاج نگار کو ایک خاتون افسانہ نگار پر مضمون پڑھنا پڑے گا۔ اگلے وقتوں میں دو نیک ستاروں کے ایک برج میں جمع ہونے کو قران السعدین کہتے تھے لیکن دو دُم دار ستاروں کو ایک دوسرے کی قسمت کا حال بتاتے دیکھا نہ سنا۔ جو کچھ فلک دکھائے سو ناچار دیکھنا، آج کی رونقِ محفل محترمہ بشریٰ رحمٰن ایک کثیر التصانیف اور جامع الحیثیات ادیبہ ہیں۔ ناول نگار، افسانہ نویس، سیاست داں، سابق ممبر پنجاب اسمبلی، ممتاز سماجی کارکن، فعال فیمی نسٹ (Feminist) شعلہ بیاں خطیبہ، شاعرہ، کالم نگار، ایڈیٹر و پبلشر، ایک سلسلۂ عالیہ سے بیعت، بے شمار عمرے اور خدا جھوٹ نہ بلوائے تو نو حج کر چکی ہیں۔ جو بارہ اوصاف ہم نے ابھی گنوائے، ان میں سے ایک بھی ہماری ذات بے صفات میں نہیں پایا جاتا۔ گمانِ غالب ہے کہ صرف اور صرف اسی کوالی فی کیشن کی بنا پر ہمیں محترمہ کے فن و شخصیت پر اظہار رائے و رشک کی دعوت دی گئی ہے۔

بلائے جاں ہے غالبؔ اس کی ہر بات
عبارت کیا، ''عبادت'' کیا، ادا کیا

بشریٰ رحمٰن کا پہلا افسانہ ''یادوں کے دیپ جلے'' ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا تو ان کی عمر صرف دس برس تھی...... (وقفہ) یہ وقفہ میں نے اس لیے دیا کہ خواتین دل ہی دل میں محترمہ کی عمر کا حساب لگا کر اپنی عمر سے موازنہ انیس و دبیر کر سکیں۔ یہ افسانہ ہم نے پڑھا ہے۔ اتنی کچی عمر میں ایسی پکی پکی باتیں کی ہیں کہ اب کہیں جا کے ہماری عقل میں آئی ہیں۔ پر بہت دیر ہوگئی۔ اب عقل کو مخاطب کر کے ہم یہی کہہ سکتے ہیں:

اب مرے پاس تم آئی ہو تو کیا آئی ہو

دس برس کی عمر ہی کیا ہوتی ہے۔ اس عمر میں تو بچہ اگر قتل بھی کر دے تو جیل نہیں جانا پڑتا۔

والدین البتہ کھنچے کھنچے پھرتے ہیں۔انہوں نے اپنے ایک انٹرویو میں بیان کیا کہ میں بارہ برس کی عمر سے اپنی شادی تک باقاعدہ ڈائری لکھتی رہی۔ ہم نے اس ڈائری کے بھی اقتباسات لطف، حیرت اور رشک کے ملے جلے جذبات کے ساتھ پڑھے ہیں۔ گیارہ بارہ برس کی عمر میں قلم پکڑنا تو دور کی بات ہے۔ہمیں تو ڈھنگ سے غلیل پکڑنی بھی نہیں آتی تھی۔ چڑیا پر کبھی ٹھیک نشانہ نہیں لگا۔ نشانہ آج بھی خطا ہوتا ہے۔ہاں، چڑیا خود ہی ترس کھا کر ہمارے قدموں پر آن کے خودکشی کر لے تو اور بات ہے۔

ہم پیر و مرشد حضرت ممتاز مفتی کی ہیر اتراش خاکہ نگاری کے دل سے قائل و قتیل ہیں۔ مرزا انہیں ''گرینڈ اولڈ مین آف اردو لٹریچر'' کہتے ہیں۔ جیسے جیسے ان کی عمر بڑھتی جاتی ہے، قلم اور زیادہ جوان بلکہ نوجوان ہوتا جا رہا ہے۔ میں انہیں یکے از صاحبانِ کیف و حال سمجھتا ہوں۔ وہ دنیا کے سب سے زیادہ تند و تیز نشے کے عادی ہیں۔ وہ لفظ کا نشہ کرتے ہیں، جس کا کوئی اُتار نہیں۔ ایسے ہی کسی نشے کے بارے میں استاد ذوق کہہ گئے ہیں:۔

پیرِ مغاں کے پاس وہ دارُو ہے جس سے ذوق
نا مرد مرد، مرد جواں مرد ہو گیا

انہوں نے ایک نئی تکنیک ایجاد کی ہے۔ انہیں ہر شخص کے اندر ایک طوائف نظر آتی ہے۔اسی کلیدی استعارے کے حوالے سے وہ اپنے ممدوح اور ممدوحہ کی شخصیت کا تجزیہ کرتے ہیں۔اپنے رفیقِ دیرینہ تخیّی اشفاق احمد خان کے اندر بیٹھی ہوئی طوائف کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

طوائف کی پشواز کبھی کبھی کھلنے لگتی۔ اس لئے نہیں کہ اشفاق کے اندر کی طوائف بہت نمایاں تھی، بلکہ اس لئے کہ وہ میرے اندر کی طوائف سے زیادہ بھڑکیلی تھی، ہر فن کار میں ایک طوائف ہوتی ہے۔ کسی میں ننگی، کسی میں ادھ کھلی، کسی میں مثلاً ابوالاثر (حفیظ جالندھری) میں بالکل ننگی تھی۔ محمد طفیل میں مستور ہے۔ انتظار میں ادھ کھلی ہے۔ اشفاق میں گھونگھٹ نکال کر سامنے بیٹھی رہتی ہے۔

ایک دن بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈال کے پوچھیں تو سہی کہ تمہارے اندر جو ڈیرے دار طوائف تمہارے نام پہ بیٹھی ہے۔ وہ کس حال میں ہے؟ اندر سے جواب آیا کہ طوائف لفظ کے جال، بی کے جنجال میں ہے۔ تماش بینوں اور نامحرموں کے سامنے مجرا نہیں کرتی۔ صرف اپنی

ہم مذاق طوائفوں کے سامنے Fool's cap اوڑھ کے ناچتی گاتی، دھمال ڈالتی ہے۔

وہ عفیفہ فرشی سلام کرتی ہوئی رخصت ہوگئی تو ہمیں کرید ہوئی کہ ذرا سراغ تو لگائیں کہ بشریٰ رحمٰن کے اندر کون براجمان ہے۔ کہیں ان کے اسم با مسمّٰی میاں عبدالرحمٰن تو ہم سب مردانہ طوائفوں کا مجمع لگائے، پشواز پہننے اور اُتارنے کے آداب پر گفتگو نہ کررہے ہوں۔ مگر خدشہ غلط نکلا۔ پتہ چلا کہ بشریٰ بی بی کے اندر تو مذکورہ بالا بارہ صفات والی بارہ بشرائیں بیٹھی ہیں اور بارہ کی بارہ میاں عبدالرحمٰن کے حبالۂ نکاح میں ہیں۔ بارہ دری میں چادر کا بکل مارے، دوزانو بیٹھی میاں کی مالا جپتی اور جھوم جھوم کے خواجہ غلام فرید کے ابیات پڑھتی ہیں۔ بارہ دری کا ہر در دلکشا ایک حجرۂ ہفت بلا میں کھلتا ہے جہاں اُس نے قربِ زیست اور کربِ آگہی دونوں کا ذائقہ چکھا اور بے مزہ نہ ہوئی۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے۔ مانگے تانگے کے اس استعارے سے ہمارا عجزِ بیاں صاف جھلکتا ہے۔ درحقیقت ہم کہنا یہ چاہتے تھے کہ خدا اس جوڑے کو نظر بد سے بچائے، ان کی آسودہ ازدواجی زندگی کو وہ لوگ بڑے رشک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جنہیں پڑوسی کا لان زیادہ سبز اور اُس پر کھلے عارض کے گلاب زیادہ سرخ نظر آتے ہیں۔ سہرے کے پھول پوری طرح مرجھانے سے پہلے ہی دولہا سبز سے سبز تر اور سرخ سے سرخ تر کی تلاش میں دائیں بائیں انکھیوں سے دیکھنے لگتا ہے۔ چنانچہ مرزا، مرد کی نگاہ کی دو قسمیں بتاتے ہیں: نگاہِ صغیرہ اور نگاہِ کبیرہ۔ میرا نہیں، کسی دانائے رازِ درونِ خانہ کا قول ہے کہ شادی ایک ایسی رومینٹک کہانی ہے جس میں ہیرو پہلے ہی باب میں مرجاتا ہے۔ مگر ان دونوں کے کیس میں ایسا نہیں ہوا۔ ان کے ازدواجی رومانس نے آبِ حیات نہ صرف پیا ہے۔ بلکہ غسل بھی اسی سے فرمایا جاتا ہے۔ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کی وجہ شہرت بھی ہیں۔ فقیر تو اس بی بی کو بس یہی دعا دے سکتا ہے کہ:

شوہرِ نامدار کو اور بھی نامدار کر

بشریٰ بیگم کی ذہانت، فقرہ طرازی اور قلم کاٹ سے بڑے بڑوں کا ناطقہ بند ہوتے دیکھا ہے۔ اگر اُن کے قلم مردافگن سے امان پاؤں تو ایک مرتبہ پھر حضرتِ ممتاز مفتی کا قول نقل کرنے کی جسارت کروں گا۔ نقلِ کفر کفر نباشد۔ ...

بشریٰ رحمٰن جاگیردارنی تھی۔ رحمٰن نو دولتہ تھا۔ یہ رکھ رکھاؤ کی گود میں پلی تھی۔ وہ ''ٹپر واسیا'' (پنجابی میں خانہ بدوش کو کہتے ہیں۔اس سے بھی زیادہ قابلِ رحم وہ مرد ہوتے ہیں جو اہل خانہ بدوش پھرتے ہیں) تھا۔ یہ کومل تھی، وہ تیور تھا۔ یہ بھیرویں تھی، وہ دیپک تھا۔ شبنم اور شعلے کا میل دیکھ کر میں گھبرا گیا۔ میں نے رحمٰن سے پوچھا، یہ سبز پری کہاں سے اٹھالایا ہے؟ تو بولا، ہمارے نصیب میں سبز پریاں ہی لکھی ہیں۔ میں نے کہا، اب ہوگا کیا؟ بولا، اب ہم اس کی رَکشا کریں گے۔ میاں بیوی کے تعلق کے اسرار سمجھنا میرے جیسے کتابی آدمی کے بس کی بات نہیں۔ تخلیے کے بھید کس نے جانے ہیں...... پتا نہیں کون کس کی رَکشا کررہا ہے۔ رحمٰن کی طرف دیکھتا ہوں تو لگتا ہے کہ وہ بشریٰ کی رَکشا کررہا ہے۔ بشریٰ کی طرف دیکھتا ہوں تو لگتا ہے، جیسے وہ رحمٰن کی رَکشا کررہی ہے۔ شاید دونوں ہی ایک دوسرے کی رَکشا کررہے ہیں۔

ہم تو اس کا یہ مطلب سمجھے کہ میاں عبدالرحمٰن، بشریٰ کے محافظِ خصوصی اور بشریٰ میاں صاحب کا بازوئے شمشیر زن ہیں۔

بشریٰ رحمٰن سفر کے کسی مرحلے میں بھی حفاظتی بیلٹ کی محتاج نہیں رہیں۔ نہ ایسے شوہر کی دست نگر جو اپنی انگوچیل بیوی کی اس طرح پاسبانی کرے، جیسے وکٹ کیپر ہمہ وقت وکٹ کے پیچھے بہ حالتِ رکوع چوکس کھڑا رہتا ہے۔ وہ ہر حیثیت سے اور ہر میدان میں اپنی خود اعتمادی، ایک دل آویز ریاستی تمکنت، جراتِ فکر واظہار اور بے خوفی کا لوہا منوا چکی ہیں۔ وہ سوچتی مردوں کی طرح ہیں، محسوس عورت کی طرح کرتی ہیں، لکھتی اپنی ہی طرح ہیں۔ عورت کا سب سے بڑا مسئلہ مرد ہے، جو بہ یک وقت اس کا بدترین دوست اور بہترین دشمن ہے (لغت میں بھی خصم کے معنی دشمن اور شوہر ہیں)

چمکارے، چمکار کے مارے

مارے، مار کے پھر چمکارے

کسی نہ کسی نہج اور عنوان سے یہی دوست نما دشمن اور حریف نما حلیف ان کی تحریروں، بالخصوص فکشن کا کلیدی موضوع رہا ہے۔ اسی لئے مردان کے کالم بے صبری، اُمید اور اندیشے کے ملے جلے جذبے کے ساتھ ایسے پڑھتے ہیں جیسے شریر لڑکے اپنی اسکولی رپورٹ پڑھ کر

کہتے ہیں: ''ابو، اگر آپ ہماری کلاس میں ہوتے تو یہ مس آپ کو اس سے بھی خراب رپورٹ دیتیں''۔

دیکھیے، رکشا والی بات ادھوری رہی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں خواتین، فکشن نگاروں اور شاعرات کو جن مشکلات، خطرات، اور آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ ان سب کا سبب اور سرچشمہ مرد حضرات ہیں۔ ادیبہ یا شاعرہ خوش شکل بھی ہو تو ان خطرات کو آپ سو سے ضرب دے دیجئے۔ سو سے ہماری مراد سو مرد ہیں۔ بشریٰ ایک جگہ لکھتی ہیں: ''عورت کی زندگی کا کوئی حصہ نہ اسکینڈل سے محفوظ ہے، نہ الزامات سے۔ وہ غریب اگر مذہبی فریضہ سمجھ کر بھی کسی کی بیمار پرسی کرے تو اسے معاشقہ سمجھا جاتا ہے۔ رونا اس کا ہے کہ کم بخت بیمار خود بھی یہی سمجھتا ہے۔ اس بیچاری کو بچاؤ کے لئے اپنے گرد تند جبینی، ترش روئی اور تنومند مجرموں کا حصار کھینچنا پڑتا ہے۔ نقشہ وہی ہوتا ہے جس کی تصویر امیر خسرو نے کچھ یوں کھینچی تھی کہ جب بادشاہِ حسن نکلتا ہے تو چہار سو عاشقوں کا ازدحام ہوتا ہے۔ ایک طرف چابک سوار ہوتے ہیں اور دوسری طرف مسکین گدا:

سلطانِ خوباں می رود، ہر سو ہجومِ عاشقاں
چابک سواراں یک طرف، مسکیں گدارا یک طرف

چابک غالباً کیا یقیناً، گھوڑوں کی بجائے مستحقین یعنی عشاق کی پیٹھ کی تواضع کے لئے ہوتے تھے۔ اس شعر میں مسکین کا مطلب مسکین ہی ہے۔ لیکن دبئی میں ہمیں ایک دوست نے بتایا کہ یہاں ہم صرف ایک بیوی والے شخص کو مسکین کہتے ہیں۔

کراچی کی ایک شاعرہ نے اپنے شوہر کی موجودگی میں ہمیں بتایا کہ مشاعرے میں ان کے شوہران کو ڈائس پر نہیں بیٹھنے دیتے۔ بالکل آخری صف میں اپنے پہلو میں بٹھا کر خود خزانے کے سانپ کی طرح کنڈلی مار کے بیٹھ جاتے ہیں۔ جب نام پکارا جاتا ہے تو وہ ڈائس تک چھوڑنے جاتے ہیں۔ شعر کی داد کے جواب میں جھک جھک کے ''آداب! آداب'' ابھی نہیں کہنے دیتے۔ فرماتے ہیں بعضا بعض اس سے بھی excite ہو جاتا ہے۔ کلام سنا کر وہ واپس حصارِ زوجیت میں آجاتی ہیں۔ موصوفہ نے یہ بھی بتایا کہ جب وہ اپنی تازہ غزل کسی رسالے کے ایڈیٹر کے نام پوسٹ کرنے کے لئے اپنے شوہر کو دیتی ہیں تو وہ چپکے سے لفافہ کھول کر اشعار میں اصلاح کر دیتے ہیں۔ بیگم نے یہ بھی کہا کہ

میرے اشعار میں جتنے بھی سکتے پڑتے ہیں وہ سب شوہرانہ اصلاح کے سبب ہیں۔ مزید برآں، ہجرو فراق سے متعلق جتنے بھی اشعار ہوتے ہیں، وہ سب کاٹ دیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جب میں چوبیس گھنٹے تمہارے کولھے سے لگا بیٹھا رہتا ہوں تو پھر دوری، مہجوری کی شکایت کیسی؟ بیوی جب یہ بیان کر چکیں تو شوہر نے فرمایا: ''بخدا! مجھے تمہاری پاک دامنی پر ذرّہ برابر شبہ نہیں، مگر تمہارح حماقت پر کامل یقین ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دامنِ یوسف پر ہاتھ ڈالنے کا سبب پیدائشی بدچلنی نہ سہی، الہامی حماقت بھی ہوسکتا ہے۔''

حرفِ مدعا تک آنے سے پہلے ایک وارداتِ قلبی اور بیان کرتا چلوں۔ اس واردات کا تعلق میرے بائی پاس شدہ قلب سے نہیں۔ ایک شاعرہ جن کی شکل ان کے کلام سے بہتر تھی...... یعنی چشمِ مست عجیبے، زلفِ درازِ عجیبے ...... بیرونِ ملک مشاعرہ پڑھنے گئیں۔ کچھ دن تو لوگ انہیں مصرعِ طرح کی مانند اٹھائے اٹھائے پھرے۔ پھر ایک سخن فہم نے داد دیتے دیتے شادی کی انگوٹھی پہنا دی۔ اس سانحۂ روح فرسا کی خبر ملتے ہی ادبی دنیا میں ایسی صفِ ماتم بچھی کہ اس کا ایک سرا پشاور میں تھا تو دوسرا کراچی میں۔ بعض شعراء نے بقیہ عمرِ عزیز مردانہ عدّت میں گزارنے کا عہد و اعلان کیا۔ وہ سکتہ جو پہلے اشعار میں پڑتا تھا، اب خود اُن پر پڑا۔ مرزا دلاسا دیتے دیتے اور نعم البدل کی اُمید دلاتے دلاتے ایسے مایوس ہوئے کہ تھک کر خود صفِ عدّت گزاراں میں جا پڑے۔ چھ ماہ بعد وہ پاکستان آئیں تو جان میں جان آئی۔ ہمارا مطلب ہے، کلام میں جان آئی۔

یہ تمہید دل پذیر و غیبت آثار ہم نے اس لئے باندھی کہ بشریٰ رحمٰن کا طرزِ تپاک و طریقۂ واردات بالکل مختلف ہے۔ وہ مردوں کو عورت سمجھ کر گفتگو کرتی ہیں اور مرد اسے کھلی منت سمجھ کر خوش ہوتے ہیں۔ وہ مردوں سے مرعوب ہیں نہ خوف زدہ، بے خوف و خطر اندرون و بیرونِ ملک جہاں چاہتی ہیں، جاتی ہیں۔ اور جدھر جاتی ہیں، مردانہ ہجوم کائی کی طرف پھٹ کر انھیں راستہ دیتا ہے۔ انہوں نے اسمبلی کے الیکشن بھی لڑے ہیں اور ایک الیکشن میں ہاری بھی ہیں۔ ہارنے کے تقریباً فوراً بعد ان سے ہماری ملاقات ہوئی، زہرا نگاہ نے کہا تھا کہ ''کچھ لوگ بکھر کر بھی تماشا نہیں ہوتے''۔ یہ نہ ٹوٹیں، نہ بکھریں، نہ تماشا بنیں۔ ہم نے اشارتاً ہمدردی کی تو ''نہ ان کی جیت نئی ہے، نہ اپنی ہار نئی'' کہہ کر اپنی نثر کی طرح مسکرا دیں۔ ان کی شگفتہ نثر پسلیوں میں انگلی سے گدگدی کر کے نہیں ہنساتی، بس آپ

ہی آپ ہنستی رہتی ہے۔

کبھی آپ ہنسے، کبھی نین ہنسے، کبھی نین بیچ ہنسے کجرا

مزاح نگاروں کے قبیلے کے سرخیل حضرتِ ضمیر جعفری نے تجویز پیش کی ہے کہ ان کو مزاح نگاری کا ہلالِ جرأت ملنا چاہئے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

اس کی نثر کا جادو، جرأت، مسرت اور حیرت کے اجزا سے تربیت پاتا ہے۔ جرأت جیسے چاند بی بی دروازے پر تلوار تانے کھڑے ہو۔ مسرت جیسے کھلی ہوئی کپاس کا کھیت ہنس رہا ہے اور حیرت جیسے گھوڑی نے زیبرا جنم دیا ہو۔

ہم مرشدی ضمیر جعفری سے نہ صرف کلّی طور پر متفق ہیں بلکہ اتنا اضافہ کریں گے کہ گھوڑی کے ہاں زیبرا پیدا ہونے پر دیکھنے والوں اور خود گھوڑی کو تو تعجب ہوگا ہی، لیکن سب سے زیادہ گھوڑے کو ہوگا۔

پنجاب اسمبلی نے بشریٰ رحمٰن کو باقاعدہ ایک قرارداد کے ذریعے ''بلبلِ پاکستان'' کے خطاب سے نوازا۔ اسمبلی میں ان کی تصویر بھی بہترین پارلیمنٹیرین کے عنوان کے ساتھ آویزاں ہے۔ ان کی کچھ تقریریں ہم نے بھی گوشِ نصیحت نیوش سے سنی ہیں۔ تقریر کی داد اس طرح ملتے دیکھی جیسے خوش ذوق سامعین مرصع غزل کے ایک ایک شعر پر واہ واہ کر رہے ہوں۔ بذلہ سنج، حاضر جواب اور حاضر دماغ ایسی کہ اگر آپ انہیں گہری نیند سے جگا کر کسی بھی موضوع پر فی البدیہہ تقریر کرنے کو کھڑا کر دیں تو نیم غنودگی کے عالم میں بھی ایسی پُرمغز اور شگفتہ تقریر کریں گی کہ خود ان کی نیم وا، نیند بھری آنکھیں سامعین کی پُرشور تالیوں سے کھلیں گی۔

اسمبلی میں اور اسمبلی سے باہر اُن کی بذلہ سنجی اور حاضر جوابی کے بے شمار لطیفے مشہور ہیں۔ بڑے بڑے پھکڑ، پھبتی باز اور کٹ کھنے مرد جو اپنی دُم میں سوئے فلک اٹھائے، منہ مارتے پھرتے ہیں، ان کے سامنے چوں نہیں کرتے:۔

ٹک ٹک دیدم دُم نہ کشیدم

نمونے کے طور پر اور ہمیں خوف زدہ کرنے کے لئے صرف دو مثالیں کافی ہیں:

فضل حسین راہی اپنی ترش و تیز فقرے بازی کے لئے ایک زمانے میں بہت مشہور تھے۔ ایک دفعہ اٹھ کر بولے کہ بیگم بشریٰ رحمٰن نے میری بات کو غلط سمجھا ہے۔ میں تو انہیں اپنی ماں سمجھتا ہوں۔

بشریٰ رحمٰن نے فوراً کھڑے ہو کر بڑی رسان سے جواب دیا، ''میں فضل حسین راہی کی بے حد ممنون ہوں کہ وہ مجھے ماں سمجھتے ہیں۔ اس رشتے سے میں ان کی خدمت میں التماس کروں گی کہ کسی روز گھر آ کر اپنے والد کو بھی دیکھ جاؤ۔''

فقرہ اس خاتون کا زیور نہیں، زرہ بکتر ہے۔

ایک دفعہ ناسازیٔ طبع کے باعث بشریٰ رحمٰن کچھ دن اسمبلی سے غائب رہیں اور اسمبلی سے وہ رونق اور چونچالی بھی غائب رہی جو ان کی بذلہ سنجی سے عبارت تھی۔ جب وہ صحت یاب ہو کر آئیں تو وزیر معدنیات غلام حیدر وائیں نے اسمبلی میں بڑی گرم جوشی سے استقبال کرتے ہوئے کہا کہ محترمہ کی صحت یابی کی خوشی میں، میں ایک شعر ان کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ پھر انہوں نے ایک فلمی غزل کے شعر کو مزید بگاڑ کے اس طرح پڑھا کہ بالکل ان کا اپنا معلوم ہونے لگا:۔

آج کے روز وہ آئے ہیں بڑی دیر کے بعد
آج کا روز بڑی دیر کے بعد آیا ہے

جواب آں غزل کے طور پر بشریٰ رحمٰن بولیں، ''جناب اسپیکر! جناب غلام حیدر وائیں بڑے اچھے سیاسی کارکن ہیں۔ آپ کے توسط سے بندی ان کی خدمت میں التماس کرتی ہے کہ آئندہ بسوں اور ٹرکوں کے پیچھے لکھے ہوئے شعر نہ پڑھا کریں، ورنہ پنجابی فلموں والے ان کو پکڑ کر لے جائیں گے۔ کیونکہ پنجابی فلموں میں ابھی تک ان کی عمر اور ان کے تن و توش کے ہیرو آ رہے ہیں۔''

محبی و مخدومی کرنل محمد خاں صاحب نے بشریٰ رحمٰن کے سفرنامے ''براہِ راست'' کے فلیپ پر ان کے طرزِ تحریر کی داد دیتے ہوئے لکھا ہے: ''کاش یہ کتاب میں نے لکھی ہوتی۔ میں چاہوں بھی تو بشریٰ رحمٰن جیسا شگفتہ نہیں لکھ سکتا''۔ ہم تو کرنل صاحب جیسا بھی شگفتہ نہیں لکھ سکتے۔ لہٰذا بشریٰ رحمٰن کے نقشِ قدم پر چلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم نے جب اپنی اور کرنل صاحب کی کوتاہ قلمی پر غور کیا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ بشریٰ رحمٰن کی طرح لکھنے کے لئے دو الیکشنوں اور چار زچگیوں سے گزرنا اور میاں عبدالرحمٰن کی زوجیت میں ہونا ضروری ہے، جس سے ہم بوجوہ قاصر ہیں۔ اپنے ایک انٹرویو

میں بشریٰ نے کہا تھا کہ ''عورت کو خاک کرنے کے لئے صرف ایک بچہ ہی کافی ہے۔'' چار پیارے پیارے بچوں کے بعد خواجہ غلام فرید کی یہ دیوانی اس طور خاک ہوئی کہ سرمہٗ چشمِ دانشوراں بن گئی۔

ہم نے بشریٰ رحمٰن کے سفرنامے ''ٹک ٹک دیدم نو کیو'' اور ''براہِ راست'' بڑے شوق سے پڑھے۔ ہم بلاخوفِ تردید کہہ سکتے ہیں کہ گزشتہ چند برسوں میں یہ تنہا سفرنامے ہیں جن میں، سڑک پر خوش شکل خواتین کا ذکر انہیں فی الفور اپنے عقدِ نکاح میں لانے کی خواہش، کے بغیر کیا گیا ہے۔ یہ خوبی بیگم اختر ریاض الدین کے سفرناموں میں بھی تھی مگر انہوں نے سچ مچ قلم توڑ دیا، اور اپنی زندگی سماجی اور رفاہی کاموں کے لئے وقف کر دی۔ انہیں خواتین کا مولانا ایدھی کہنا چاہیے۔ سفرناموں کا ذکر مخدومی کرنل محمد خاں صاحب کے ''بسلامت روی'' کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ یہ سفرنامہ بہت دلچسپ ہے۔ اس کے ہر تیسرے صفحے پر ایک نئی خاتون عزیز از جان ودشمنِ ہوش و ''کیش'' نمودار ہوتی ہے۔ تین صفحوں بعد قضائے الٰہی وخوفِ اہلیہ سے وہ رخصت ہو جاتی ہے۔

حیف در چشم زدن صحبتِ بد آخر شد

ابھی وہ ٹھیک سے دل سے دور اور آنکھ سے اوجھل نہیں ہو پاتی کہ ایک اور خاتون مسافر کے ایمان کی آزمائشِ جاریہ کے لئے نقابِ ورق الٹتی ہے۔ کرنل صاحب نے از راہِ دوستی ودلداری ہمیں ان کی جناب میں مؤدبانہ گستاخی کا لائسنس دے رکھا ہے۔ چنانچہ ایک دن ہم نے ہمت کر کے عرض کیا کہ ''کرنل صاحب! آپ نے سفرنامے میں مسافر کی ضرورت سے زیادہ میمیں ڈال دی ہیں۔ اگلے ایڈیشن میں کم از کم نصف کو تھوڑا بہت فارن ایکسچینج دے دلا کر باہر کریں۔ اپنے دل پہ پتھر رکھ کے بولے: ''یہ بھی کر دیکھا، جس کو بھی نکالتا ہوں وہ روتی بہت ہے۔''

الحمدللہ! بشریٰ رحمٰن کے سفرنامے زبان واملا کی غلطیوں، مردانہ لغزشوں اور عورتوں سے پاک ہیں۔ یادش بخیر! ہم نے بھی ایک طویل سفرنامے کا ڈول ڈالا تھا۔ ملکوں ملکوں گھومے، لیکن چونکہ ہر سفر میں بیوی ساتھ رہیں۔ اس لئے ہمارا سفرنامہ کسی پہنچے ہوئے سنیاسی کی تیرتھ یاترا معلوم ہوتا تھا۔ ''پہنچے ہوئے'' سے ہمارا مطلب ہے بیوی تک پہنچے ہوئے۔ پکی عمر کے لوگ...... پکی عمر سے ہماری مراد ہے عمرِ یاس وہراس کو پہنچے ہوئے سادہ دل بندے...... کبھی کبھار ہماری طرح تن تنہا، شمشیر برہنہ نکل بھی جاتے ہیں تو:-

سوادِ رومۃ الکبریٰ میں بیوی یاد آتی ہے

دیکھیے، عالی جی ہماری طرح، جہاں بھی جاتے ہیں، کیسی محبت، کیسی للک سے اپنی بیگم کو یاد کرتے ہیں:۔

کئی کئی بار کئے ہیں ہم نے سات سمندر پار
گھر والی سی کوئی نہیں تھی، ناریں ملیں ہزار

ہمارا پسندیدہ، یہ خوبصورت اور زوجہ فریب دوہا اس لائق ہے کہ ہر مرد جو یکہ وتنہا بلکہ ہکا بکا وتنہا یورپ اور امریکہ میں منزل بہ منزل اور ہر منزل پہ شب خون مار کے گھر لوٹے تو اپنی بھولی بیگم کو سنائے اور اپنی نیک چلنی اور نابینا ہونے کے ۱۰۰ میں سے ۱۰۵ نمبر حاصل کرے......۵ زائد نمبر ترنم سے سنانے کے۔ لیکن عالی جی نے بات بالکل خدا لگتی بلکہ خدائے مجازی لگتی کہی ہے۔ ہم نے بھی سارا یورپ بدنظری کی چھلنی سے کئی بار چھان مارا، لیکن صاحب! توبہ کیجئے، ہماری Coloured بیگم کا مقابلہ Colourless چڑیلیں کیا خاک کریں گی، ہمیں تو اپنے جیسے ناک نقشے اور رنگ والا مرد تک سارے یورپ میں ایک بھی نظر نہیں آیا۔ سُندر نار تو بہت دور کی بات ہے، ہماری خیر و عافیت تو کسی بُری عورت نے بھی نہ پوچھی کہ ''پردیسی! ٹریولرز چیکوں کو سینے سے لگائے بولائے بولائے کیوں پھر رہے ہو؟ میں تو صرف ۲۵ پونڈ کی دوری پر ہوں۔ قصہ دراصل یہ تھا کہ اُتر جاؤں کہ دکھن، سنگ وہی سدا سہاگن۔ حد تو یہ کہ بُری عورت ہمیں عزیزہ کشور ناہید کی نام نہاد پاپ بیتی ''بری عورت کی کتھا'' میں بھی ڈھونڈنے سے نہیں ملی۔ اس کتاب کو ہم نے بڑی بے صبری سے ایک رات میں پڑھ ڈالا۔ اس میں بُرے مرد البتہ نظر آئے۔ لیکن بُرے مردوں کو دیکھنے کے لئے راتوں کی نیند حرام کر کے کتاب پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارا تو جب بھی کسی گناہ گار آدمی کو دیکھنے کو جی ہوتا ہے تو کتاب پھینک کے آئینے کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں اور مولوی محمد اسماعیل نے بچوں کے لئے جو حمد لکھی تھی، اسے حسبِ حال کر کے، سکتے سمیت پڑھتے ہیں:

آئینہ دیکھنے کو آنکھیں بنائی تو نے
آنکھوں سے دیکھنے کو انساں ہمیں بنایا

لیکن اس بی بی نے اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا اور آئینہ تحریر میں ہمیں بہت کچھ دکھایا۔ دیس دیس گئی اور نگر نگر گھومی، پر اپنے وطن کے موتیا اور صحرائے چولستان پر اترتی خنک چاندنی کو نہیں بھولی۔ لندن دیکھا، پیرس دیکھا، امریکہ اور کینیڈا کے سبھی شہر دیکھ ڈالے، پر وہ جو عالم میں انتخاب ایک شہر ہے، وہ ان کے وجود میں خوش بو کی مانند بسا ہے۔ سب کچھ دیکھنے اور ایک ایک منظر دکھانے کے بعد انہیں:۔

ستلج پر اپنا وہ شہر پرانا اچھا لگتا ہے

''منزلِ عشق پہ تنہا پہنچے''، ''باؤلی بھکارن'' اور ''نسیما جانب بطحا گزر کن''......حج اور عمرے کے سفر نامے ہیں اور ایک کیفیت قلبی کی روداد بھی۔ ان کے سفر ناموں کی سب سے بڑی خوبی وہی ہے جو کسی بھی کتاب کی ہونی چاہئے۔ یعنی readability جس کتاب میں یہ خوبی نہ ہو اُسے تو یونیورسی کے نصاب میں شامل کرلینا چاہئے، تاکہ پروفیسروں کو عبرت اور وسیلۂ معاش مہیا ہو۔ readability کا ترجمہ پروفیسر قاضی عبدالقدوس تشویق مطالعہ کرتے ہیں۔ اس میں واقعی ترجمے کی خوبی پائی جاتی ہے، یعنی اصل سے زیادہ گنجلک اور ناقابلِ فہم ہے۔ بشریٰ pen and ink والی دیدہ ریز باریکیوں سے تصویر کو گراں بار نہیں کرتیں۔ وہ دھیمے دھیمے پیسٹل رنگوں سے اپنے قاری کو ہر ملک سے قریہ بہ قریہ، کوچہ بہ کوچہ، چہرہ بہ چہرہ روشناس کراتی ہیں:

نہ آئی فقط کرکے درشن میں تنہا
اٹھا لائی آنکھوں میں ساری نگریا

(شمی صاحب سے معذرت کے ساتھ)

اپنی خطابت کے حوالے سے وہ بلاشبہ طوطیِ پاکستان ہیں۔ سفرناموں کے حوالے سے ابنِ بطوطہ بہت مشہور ہے۔ ایک مداح کی تجویز ہے کہ بشریٰ بی بی کو طوطی کے علاوہ بنتِ بطوطی کا خطاب بھی دیا جائے کہ ان دونوں میدانوں میں ان کا کوئی حریف نہیں۔

انہیں نازک مقامات سے آسان گزرنے کا فن آتا ہے۔ اچھا ناول یا افسانہ نگار جو کنواں دوسروں یعنی اپنے کرداروں کیلئے ضرورتاً کھودتا ہے۔ اس میں گرنے سے اپنے فن کو......اور خود کو

.... صاف بچالے جاتا ہے۔ اپنی مخصوص euphemistic تکنیک (خوش لفظی، سخت، تلخ یا نیم دروں نیم بروں کیفیت کو ملائم و گوارا انداز سے بیان کرنا) کو انہوں نے جا بجا ایسی خوبصورتی اور فن کارانہ مہارت سے برتا ہے کہ جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ وہ بعض inhibitions کو بڑی دلیری اور چابک دستی سے کبھی اپنے ہیرا تراش فقروں سے اور کبھی حسنِ ادا کے مخملی پیرائے سے توڑتی چلی جاتی ہے۔ عزیز یونس بٹ ایک صاحب اسلوب، ذہین اور نوجوان مزاح نگار ہیں۔ ہم نے جب ان کے ایک مضمون میں یہ پڑھا کہ بشریٰ رحمٰن کی کہانیاں پڑھ کر ''بندہ متاثر ہو نہ ہو، بالغ ضرور ہوا جاتا ہے''۔ تو یہ عقدہ کھلا کہ نورِ چشمی یونس سلمہٗ کے راتوں رات گھنی گھنی مونچھیں کیسے نکل آئیں:۔

یہ دم بھر میں کیا ماجرا ہو گیا
کہ چہرے پہ جنگل کھڑا ہو گیا

وہ خود رقمطراز ہیں کہ ان کی صحت ایسی تھی کہ گوجرانوالہ کی روایت کے مطابق ورزش کے لئے اکھاڑے گئے تو استاد پہلوان نے دیکھ کر کہا، ''تمہاری ورزش کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ روزانہ دو کشتیاں دیکھ لیا کرو''۔ بالفاظِ دیگر بشریٰ رحمٰن کی کہانیوں نے Male Hormones کے انجکشن کا کام کیا اور وہ قبل از وقت سنِ بلوغت کو پہنچ گئے ورنہ نہ جانے کب تک گلیوں میں گلی ڈنڈا کھیلتے پھرتے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض چائے کی کیتلیاں ایسی ہوتی ہیں کہ پانی اُبال کے درجے پہ پہنچ کر کھدبد کرنے لگے تو ایسے زور سے سیٹی بجاتی ہیں کہ اہلِ محلہ تک خبردار ہو جاتے ہیں کہ کسی کا پانی جوش مار رہا ہے۔ ہمارے یہاں بعض ادیبوں اور شاعروں کی کیتلیاں ٹھنڈے ٹھار پانی سے ہی سیٹی بجانے لگتی ہیں۔ قبر کا حال مردہ ہی جانتا ہے اور جوانی کا حال خدا اور خود پر روشن ہوتا ہے۔ خدا گواہ ہے۔ ہمیں تو اپنے بالغ ہونے کا علم صرف ایک تاروں بھری رات کو اچانک اس وقت ہوا جب قبلہ والد صاحب نے ۳۰ شعبان کو ہمیں اطلاع دی کہ صبح سے تم پر تیس روزے فرض ہو گئے! وہ مطلع نہ کرتے تو کون جانے ہم آج تک عالم بے خبری میں بالغ ہوئے بے کار پھر رہے ہوتے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ ہم نے اپنے بے فصل میوہ ہائے جوانی کو خواتین کے افسانوں کی پال میں لگا کر نہیں پکایا۔ تاہم ہمیں یہ جاننے کی کرید ہوئی کہ نئی نسل بالغ ہونے کے لئے کیا کیا جتن کرتی اور کیسے کیسے کشٹ

اُٹھاتی ہے۔ معلوم ہوا کہ ادبی کتابیں تک پڑھ ڈالتی ہے۔

مرزا ایک زمانے میں بکری کے گوشت کے بغیر لقمہ نہیں لے سکتے تھے۔ تنجن یعنی وہ میٹھے چاول جن میں گوشت ڈالا جاتا ہے۔ زندگی میں پہلی اور آخری بار ان ہی کے ہاں چکھا، جس کی کراہت آج بھی ذہن وزباں پر باقی ہے۔ پھر ایک دن سنا کہ برنرڈ شا کی تعلیمات سے ان کا قلب ایسا گداز ہوا کہ یکا یک ویجی ٹیرین ہو گئے اور بکری کو ایسی نظروں سے دیکھنے لگے کہ کوئی بکرا دیکھ لیتا تو وہیں سینگ گھونپ کے ان کا خون کر دیتا۔ یہ سب کچھ ہوا، پر گوشت کی ہُڑک نہیں گئی۔ idealist یعنی آدرش پسند آدمی ہیں۔ وہ کوئی ایسی طلسماتی ترکیب دریافت کرنا چاہتے تھے کہ بکری کو ذبح کئے بغیر اس کا گوشت تناول فرمائیں۔ یہ بھولا بسرا واقعہ میں بشریٰ رحمٰن کی انتہائی محبت، عقیدت اور ہنرمندی سے لکھی ہوئی Obituaries (وفیات) پڑھ کر یاد آیا۔ ڈاکٹر نذیر احمد اور پروفیسر کرم حیدر پر ان کے دل گداز تعزیتی مضمون پڑھ کر مرزا کہنے لگے کہ یہ کیا ممکن ہے کہ میرے فوت ہوئے بغیر وہ مجھ پر ایسا کالم لکھ دیں۔ اس پر پروفیسر قاضی عبدالقدوس ایم اے، بی ٹی اپنی منشیانہ زبان میں بولے کہ برادرمن! فوتیدگی سے پہلے آبدیدگی ممکن نہیں۔

بشریٰ نے اپنی صاحب دیوان والدہ مرحومہ اور دیگر مرحومین...... احمد علی تالپور، سید محمد نواز، سلمیٰ تصدق، نثار فاطمہ اور پروفیسر کرم حیدری پر زندہ رہنے والے مضامین لکھے ہیں۔ جب ہمارا کوئی حبیب لبیب یا عزیز ساتھی رخصت ہوتا ہے تو ہمارے اپنے وجود کا بھی ایک حصہ مر جاتا ہے۔ پھر جب بھی ہم اُسے محبت اور کلمۂ خیر کے ساتھ یاد کرتے ہیں تو نہ صرف وہ زندہ ہو جاتا ہے بلکہ ہمارے وجود کا ماضی تلے مدفون وہ حصہ بھی دوبارہ جی اٹھتا ہے:

بُلھیا اساں مرنا ناہیں
گور پیا کوئی ہور اے

بشریٰ نے اپنے مرحوم خسر کا لازوال خاکہ جس محبت اور دردمندی سے لکھا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ساس سسر، موسم اور حکومت کے خلاف لکھنے کے لئے دماغ پہ زیادہ زور نہیں دینا پڑتا۔ ہاں ان کے حق میں کلمۂ خیر کہنے کے لئے بڑی کشادہ دلی، جرأت اور بعض اوقات موٹی کھال

اور اتنی ہی موٹی نظر کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ان کی محبت اور سعادت مندی کا ثبوت ہی نہیں، قلم کا بھی اعجاز ہے کہ انہوں نے ایک مرحوم بزرگ کو زندہ لاکر کھڑا کر دیا۔ دیکھنے والے اس تصویر پر ستائش کے پھول نچھاور کرتے رہیں گے۔

ایک دن ہم نے اپنی بہو کو یہ خاکہ پڑھوایا۔ بہت پسند آیا۔ ہم نے کہا کہ دیکھ بی بی! ایسی بھی بہویں ہوتی ہیں جو اپنے خسر کی ایسی تعریف کرتی ہیں۔ کہنے لگیں۔ مگر ان کا تو انتقال ہو چکا ہے۔

ناول ہو یا افسانہ، سیاسی تقریر ہو یا ہفتہ وار اخباری کالم، فیمی نزم (Feminism) کی ایک زیریں لہر رواں دواں دکھائی دیتی ہے۔ ہمیں فیمی نزم سے کوئی کد یا چڑ نہیں۔ لیکن فیمی نسٹ خواتین سے ڈر لگتا ہے۔ وجہ یہ کہ اگر ان سے اختلاف کیا جائے تو خفا ہو جاتی ہیں۔ اگر آپ متفق ہو جائیں تو اور زیادہ خفا ہوتی ہیں۔ خاموش رہیں تو اسے مردانہ شاونزم کا عیارانہ کیموفلاج سمجھ کر اس انداز سے ڈانٹ ڈپٹ کرتی ہیں کہ بالکل نارمل لگتا ہے۔ نارمل سے ہماری مراد ہے کہ میاں بیوی کا ساڈائیلاگ لگتا ہے۔ میاں بیوی کی گھمسان کی جنگ میں فتح ہمیشہ اس کی ہوتی ہے جو پہلے رو دے۔ میری کوریلی ایک مشہور فیمی نسٹ ہو گزری ہے۔ اس نے بڑے فخر سے کہا تھا کہ میں نے تمام عمر شادی نہیں کی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے پاس تین pets (پالتو جانور) ہیں، جو شوہر کا مکمل نعم البدل ہیں۔ ایک کتا ہے جو صبح سویرے سے غرانا شروع کر دیتا ہے۔ دوسرا طوطا ہے جو سہ پہر ہوتے ہی رٹی رٹائی گالیاں بکنے لگتا ہے۔ تیسرا ایک بلا ہے جو رات کو دیر سے گھر آتا ہے۔ محترمہ ہمارے سامنے یہ بات کہتیں تو ہم عرض کرتے کہ آپ نے شوہر کے نعم البدل کے طور پر جانور بھی پالے تو بدذات نر۔ پھر یہ بھی ہے کہ تینوں کے تینوں کھاؤ، اُڑاؤ اور اُڑن ہار ہیں، کماؤ ایک بھی نہیں۔

لیکن بشریٰ رحمن اپنے فیمی نزم کو جارحانہ رویے یا صنفی آویزش سے آلودہ نہیں ہونے دیتیں۔ وہ طوطے کی طوطا چشمی اور بلے کی شب خرامی کی تصویر تو کھینچتی ہیں مگر نہ گلے میں گھنٹی باندھتی ہیں، نہ ٹانگ توڑنے کی دھمکی دیتی ہیں۔ مرد نے جو دبیز چادر...... مرد ہی سے محفوظ رکھنے کے لئے...... عورت کو اُڑھا کر چار دیواری کا جو مردانہ حصار اُس کے گرد کھینچ دیا ہے، اس کے تل برابر روزن سے چشم حیراں کو مردوں کی بنائی ہوئی دنیا کیسی دکھاتی دیتی ہے۔ اس کا کچھ اندازہ کالموں کے

اس مجموعے میں شامل تحریروں سے بھی ہوتا ہے۔

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا

مولانا نعیم صدیقی کی کتاب ''عورت معرضِ کش مکش میں'' کے مقدمے میں عورت کے فرائض اور مرد کے لذائذ منصبی کے بارے میں لکھتی ہیں:

گویا اصل اور حقیقی عورت اس عورت کے اندر ہوتی ہے جو بظاہر مشین نظر آتی ہے اور دنیا کے ہر مرد کو وہی اصلی عورت درکار ہے جو باورچی خانے میں ہو تو رسوئی سے اس کے ہاتھوں کی خوشبو نکل رہی ہو۔ ڈرائنگ روم میں ہو تو اس کی خوبصورت گفتگو ماحول میں دھنک رنگ پتیاں برسا رہی ہو...... اور اگر بے ہمگی کے لمحے میں ہو تو گویا الف لیلوی رات آسمان سے اُتر کر بستر پر بکھر جائے۔ خود سے الجھتا ہوا، زمانے سے لڑتا ہوا، طوفان کی طرح بپھرتا ہوا اور چٹان کی طرح چٹختا ہوا مرد ایسی عورت کے آنچل کی مہک سے ہر صبح صحیح سلامت نکل کر روزگار کے سمندر میں کود جاتا ہے اور ہر شام چہرے پر نئی خراشیں لئے پھر اُسی کا سہارا لیتا ہے۔

وہ بار بار نئے رخ اور مختلف پینترے سے اپنے اصل موضوع یعنی عورت کی مظلومیت کی طرف پلٹتی ہیں۔ رقص کی ایک قدیم اصطلاح ہے۔ ''تیرہ تالی''۔ وہ باکمال رقاصہ جو تیرہ تالوں پر ناچ سکتی ہے ''تیرہ تالی'' کہلاتی تھی۔ بشریٰ نے اپنی کہانیوں میں دکھایا ہے کہ ایک گرہستی عورت کو اپنے خداوندِ مجازی کے سامنے تیرہ سے بھی زیادہ تالوں پہ ناچنا اور تھیّا تھیّا کر کے بے وجہ روٹھے ساجن کو منانا پڑتا ہے۔ پاؤں کے آبلوں کی سوزش کے باعث منہ سے نکلتی سسکیوں کو پائل کی جھنکار اور تِتکار میں چھپانے کا ہنر بھی آپ ہی آپ سیکھ لیتی ہے۔

کسی زمانے میں کالم نگاری ہمارے ہاں محض مشغلۂ شوق اور ذریعۂ عزت ہوا کرتی تھی۔ اب ماشاءاللہ حیلۂ معاش اور کل وقتی وسیلۂ رسوائی بھی ہے۔

کالم تمام حلقۂ دام عیال ہے

کالم نگاروں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ روز کنواں کھودتے اور روز پانی نکالتے اور پلاتے ہیں۔ لیکن جب سے سیاسی Polarization (قطبینی محاذ آرائی) نے شدت اختیار کی ہے،

کالم نگاروں کے مزاج و بیاں میں بلا کی برہمی و تلخی در آئی ہے۔:

صفحہ صفحہ روتا ہوں، کالم کالم وحشت ہے

بعضوں کا تو یہ احوال ہوا کہ روز کنواں کھودتے اور روز اس سے یوسفِ بے کارواں برآمد کرتے ہیں اور یہ یوسف، وہ ہوتا ہے جس کو انہوں نے کل شام ہی دستِ خاص سے کنویں میں دھکا دیا تھا۔ بشریٰ رحمٰن کنویں سے خواب زلیخا برآمد نہیں کرتیں۔ وہ اپنے ڈول سے سادہ پانی ہی نکالتی ہیں۔ ٹھنڈا میٹھا۔ گاہے ماہے اس پانی کے سوتے آبِ آہن تاب سے جا ملتے ہیں۔ جس میں لوہا گرم کر کے بجھایا جاتا ہے۔ اس دور میں سیاست، اور انسانی اقدار کے درمیان ایک آدمی ڈباؤ خلیجِ ہوسِ اقتدار حائل ہوگئی ہے۔ بشریٰ رحمٰن نے اس خلیج کو بہت قریب سے دیکھا اور دکھایا ہے۔ سیاست کی بوالعجبیوں اور ریشہ دوانیوں کو وہ اپنی سیاسی وابستگیوں سے ہٹ کر بھی دیکھتی ہیں۔ نیرنگیِ سیاست اور طرزِ تپاکِ دنیا پر اپنے ایک حالیہ کالم میں لکھتی ہیں کہ وہی لوگ جو الیکشن سے پہلے عجز و انکسار کا پیکر ہوتے ہیں، ووٹ لینے اور وزیر بننے کے بعد ان کی گردن میں سریا لگ جاتا ہے! ہم اسی مفہوم کو علامہ اقبال کے شعر میں ادنیٰ تصرف کے ساتھ یوں بیان کریں گے۔:

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی شیر ہوئے

اپنے کالموں کے مجموعے ''چادر، چار دیواری اور چاندنی'' کی تقریب رونمائی پر بشریٰ رحمٰن آمادہ نہ ہوئیں۔ لہٰذا اس شام کی محفل کے انعقاد پر احباب نے انہیں رضامند کیا، ہم مصنفہ سے متفق ہیں۔ رسمِ اجراء کے روز پر ہم نے تو آج تک کوئی کتاب بکتی نہیں دیکھی بلکہ بعض کتابوں کی رسومِ اجراء پر تو آخری رسوم کا گمان ہوتا ہے۔ تقریب رونمائی آخری دیدار ثابت ہوتی ہے۔

ہم ان کے بے حد ممنون ہیں کہ وہ ایسے پُر آشوب زمانے میں اس اُداس شہر میں تشریف لائیں۔ جب حال یہ ہے کہ کرکٹ میچ کے دوران کوئی پوچھتا ہے کہ آج کا اسکور کیا ہے تو لوگ اُسے گرنے والی وکٹوں کی تعداد بتانے کے بجائے مقتولوں کی میزانِ کل اور تاریخِ قتل بتا کر سر جھکا لیتے ہیں۔

کچھ دن ہوئے، مجھے اسلام آباد جانے کا اتفاق ہوا۔ پچیس برس پہلے سیکریٹریٹ کی نیم

تاریک گمراہ داریاں دیکھ کر جو وحشت مجھے ہوتی تھی، وہ اب دہشت میں تبدیل ہو چکی ہے۔ باخبر لوگ ان راہ داریوں کو Corridors of Power کہتے ہیں۔ میں اس کا ترجمہ ''غلام گردشِ غلامانِ بادشاہ گراں'' کرتا ہوں۔ ہمارے دوست اور کرم فرما الطاف گوہر صاحب اسلام آباد کو ''ہوس گاہ'' کہتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ہوس گاہ کی اصطلاح انہوں نے بوسہ گاہ کی وضع پر بنائی ہے جسے میر نے شعر میں استعمال کیا ہے۔ سو یہ بوسہ گاہِ عوام وخواص پیشانی ورخسار سے اُترتی اُترتی اب بادشاہ گروں کے پائے مبارک پہ آکے ٹھہر گئی ہے۔

تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ کچھ دن ہوئے اسلام آباد جانے کا اتفاق ہوا۔ پوچھنے والوں نے ہم سے جس انداز سے کراچی کا حال پوچھا، اس میں پرسشِ احوال یا پُرسے سے زیادہ باز پرس کا رنگ تھا۔ جو سوال بھی وہ کرتے تھے اس میں ان کے اپنے جواب کی آمیزش تھی۔ انداز میں جھنجھلاہٹ، کوئی ڈیڑھ سو برس پہلے غالب نے کہا تھا:

نہ پوچھ حال اس انداز سے اس عتاب کے ساتھ
لبوں پہ جان ہی آجائے گی جواب کے ساتھ

لیکن جواب پر ہی اصرار ہے فیض صاحب کی زبانی عرض ہے:

یہ خونِ خاک نشیناں تھا، رزقِ خاک ہوا

ایسے بھی سراغ رساں ہیں جنہیں مقتول کے قتل میں خود مقتول ہی کا ہاتھ نظر آتا ہے۔ گویا:

وہی قتل بھی کرے ہے، وہی لے قصاص الٹا

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ ایک بہ ظاہر سیدھے سوال کے جواب میں عاجز نے ایک منٹ اور ایک سانس میں ایک شعر اور دو مصرعے پڑھ دیے۔ جب کوئی شخص کسی سوال کے جواب میں اس طرح شعر پڑھنے لگے تو اس کی تین وجہیں ہو سکتی ہیں: اول، ہو نہ ہو وہ اشعار خود اسی کے ہیں۔ خراب شعر کہنے اور اس پر داد طلب کرنے کا شمار ہمارے ہاں Human Rights میں ہوتا ہے۔ دوم، وہ کسی کے عشق میں مبتلا ہو گیا ہے اور اپنے ''ناقابلِ اشاعت'' جذبات کا اظہار نثر میں نہیں کرنا چاہتا۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ کلمہ اعلانِ حق یعنی سچ بولنا اس کا ایمان ضرور ہے۔ مگر وہ پولس کو ''پکڑائی'' نہیں دینا چاہتا۔

یوں کہنے کو ہر شخص اس امر کا اظہار و اعلان کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے کہ وہ کراچی شہر کو امن کا گہوارہ بنانا چاہتا ہے۔ امن کے گہوارے کی رَٹ سے کان پک گئے تو ایک دن ہمیں خیال آیا کہ ذرا ڈکشنری میں گہوارے کے معنی تو دیکھیں۔ علمی لغت سے رجوع کیا تو یہ معنی نکلے:

گہوارہ: بچوں کو سلانے کا جھولا۔ وہ چارپائی جس پر محراب نما لکڑیاں لگا کر عورتوں کا جنازہ لے جاتے ہیں۔

ہم ان معنوں سے ایسے بوکھلائے کہ پھر ''امن'' کے معنی دیکھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ ان لغت نسیوں کا کوئی بھروسہ نہیں۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ یہ سب سچ، مگر ان باتوں کا تعلق آج کی شام سے کیا ہے؟ تو صاحبو! سچ بات یہ ہے کہ بشریٰ رحمٰن تو تعارف کی محتاج نہیں۔ میں نے موقع غنیمت جانا۔ سوچا، کیوں نہ اپنے شہر کراچی ۱۹۹۵ء کا تعارف ان سے کرادوں، جس کے ادیب، دانش ور ادب دوست شہری آج شام ان کے لئے گل بداماں ہیں۔ صاحبِ طرز ادیبہ اور جدید نسائی حسیّت کی ممتاز ترجمان ہونے کے علاوہ وہ ایک زیرک و باثر سیاست داں اور انتہائی مقبول و معروف کالم نگار بھی ہیں۔ اُمید ہے کہ کراچی میں ایک مدت بعد ان کا ورود و قیام موجودہ صورتِ حال کا معروضی تجزیہ کرنے میں مددگار ثابت ہوگا۔

مولانا گرامی جب مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو حفیظ ہوشیار پوری نے ایک شعر فارسی میں کہا تھا، جس کا مطلب کچھ یوں ہے کہ اے صبا، حضرت اقبال سے جا کہیو کہ تمہارا گرامی جان سے گزر گیا اور تم ابھی تک خاموش ہو۔ اس شعر کے صرف تین لفظ بدل کر میں بشریٰ رحمٰن کے ہمدردانہ توسط سے لاہور کے ادیبوں اور دانشوروں کو یہ پیغام پہنچانا چاہوں گا:۔

صبا! بہ خطۂ لاہور ایں پیامم دہ
برفت جان کراچی و تُو ہنوز خموش!

شاہ جی کی کہانی، دوسرے شاہ جی کی زبانی ☆

صدرِ گرامی قدر، خواتین و حضرات!

شفیع عقیل دانا و جہاں دیدہ اور درویش بے ریا ور لیش ہیں۔ اس تقریب دل پذیر کے لئے انہوں نے مروّجہ دستور اور روایت کے مطابق ایک سرپرست اعلیٰ ایک صدر، ایک مہمانِ خصوصی اور ایک مہمانِ اعزازی کو زحمت دینے کی بجائے چاروں کو کرسی صدارت پر بٹھا دیا۔ اس خوش گوار حالتِ ہم نشینی و مساوات منصبی کو Presidium یا مجلسِ صدارت کہتے ہیں۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود تمام
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

نظرِ بددور، شفیع عقیل پچیس سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ ایسے طرح دار مصنف اور اس کی تصنیفات کا احاطہ کرنا ایک صدر کے بس کا کام نہیں۔ آج کل وفاقی دستور کے ضمن میں **Checks and balances** کا بہت چرچا ہے۔ اگر دستور پاکستان میں بھی ایک کی بجائے چار صدر ہوتے تو جواں ہونی بار بار ہوتی آئی ہے وہ نہ ہوتی، مثلاً خاں صاحب نے، میرا مطلب ہے اسحاق خاں نے دو خودسر پرائم منسٹروں کو کھڑے کھڑے ڈسمس کر دیا اور وہ دونوں اپنے مشیروں کے سروں پر کفِ افسوس مَل مَل کر افتخار عارف کے خوب صورت شعر کا خون کرتے ہوئے دیکھے گئے:

تجھ سے بچھڑ کر زندہ ہیں
خان! بہت شرمندہ ہیں

پانچ سال ہونے کو آئے۔ میں نے اعلان کیا تھا کہ میں ادبی اعتکاف میں ہوں،

☆ اس مضمون کے بیش تر حصے شفیع عقیل کی تین کتابوں کی تقریب اجرا میں پڑھے گئے جو ۱۳ مارچ ۲۰۰۰ء کو پریس کلب، کراچی میں منعقد ہوئی تھی۔

صدارت سے معذور سمجھا جاؤں، کتابوں کی رونمائی کی تقریبوں میں مضمون پڑھنے کا نہ حوصلہ اور سلیقہ، نہ استعداد، آج اعتکاف شکنی کے بارے میں بس اتنا ہی عرض کر سکتا ہوں کہ:

لایا ہے ترا شوق مجھے حجرے سے باہر

زندگی میں صرف ایک ہی رونمائی میں بہ رضا و رغبت بلکہ بہ دلی فرحت شرکت کی ہے۔ مگر وہ غیر کتابی رونمائی تھی یعنی اصلی اور نتیجہ خیز۔ ہمارے ہاں شادی بیاہ کی رسمیں خالی از علت و مصلحت نہیں ہوتیں، مثلاً رونمائی ہی کو لیجیے۔ دولہا اس وقت تک اپنے چہرے سے عیب پوش سہرا نہیں ہٹاتا جب تک رسم نکاح قانوناً مکمل نہ ہو جائے اور دلہن کے گواہ اور وکیل آ کر سب کے سامنے یہ اعلان نہ کر دیں کہ دلہن نے قبول کیا۔ اسی طرح دولہا دلہن ایک دوسرے کی شکل و صورت کو آئینے کی خرابی اور روشنی کی کمی پر محمول کرتے ہیں۔ ہماری پانچویں اور آخری زیر تصنیف کتاب کے بارے میں ہمارے یار طرح دار مرزا عبدالودود بیگ کی تجویز ہے کہ اب یہ لازمی قرار دے دینا چاہیے کہ تقریب اجراء کے دوران مصنف بہت دبیز اور گچھا ہوا سہرا باندھے رہے گا تاکہ سامعین اسے شناخت نہ کر سکیں اور وہ ان کا فطری ردعمل دیکھ کر ہراساں نہ ہو۔

شفیع عقیل نے جب ازراہِ محبت مجلسِ صدارت میں شمولیت کی دعوت دی تو میں نے عرض کیا کہ مجھے تنقیدی یا تقریظی مضمون لکھنا نہیں آتا۔ دل کے آپریشن کے بعد ڈاکٹروں نے تقریر پر بھی پابندی لگا دی ہے۔ گویا تحریر و تقریر، دونوں سے معذور۔ بولے، ''اسی لئے تو آپ کو زحمت دے رہا ہوں۔ آپ کو قطعاً کچھ کہنا یا کرنا نہیں ہوگا، بس باوقار انداز سے خاموش بیٹھے رہیے گا۔''

عرض کیا، ''حضرت! آپ مجھے تقریب اجراء کی صدارت کی دعوت دینے آئے ہیں یا صدرِ مملکت کی؟''

پھر عرض کیا کہ میں ڈائس پر بت بنا خاموش بیٹھا رہوں، یہ مجھے قبول نہیں اس لئے کہ بت کا بھاری بھرکم اور قوتِ گویائی سے محروم ہونا ضروری ہے۔ پوجے جانے کی اہلیت رکھنا بھی لازمی ہے۔ یہ بات آپ سے پوشیدہ نہیں کہ میں علمی و تنقیدی مضمون لکھنے پر قدرت نہیں رکھتا۔ نیز آپ کی ہمہ جہت اور جامع الحیثیات شخصیت سے صحیح معنوں میں واقفیت نہیں۔ کہنے لگے، میں اپنا تعارف آپ

کرانے کے لئے تیار ہوں۔ اس کے بعد انہوں نے اپنا تعارف ایسے ہی خوبصورت طریقے سے کرایا جیسا کہ ایک سردار جی نے کرایا تھا۔ جن کے پڑوس میں ایک حسین خاتون نئی نئی آئی تھی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ خود کو کس طرح متعارف کرائیں۔ بالآخر ایک انوکھی ترکیب سوجھی۔ ایک دن وہ گھر کے باہر کھڑی نظر آئی۔ یہ لپک کر گئے اور کہنے لگے، ''دیکھیے، آپ کی بکری میری گلابوں کی کیاری چر گئی۔''

''میری تو کوئی بکری نہیں ہے!'' وہ چونک کر بولی۔

''تو میری کون سی گلابوں کی کیاری ہے۔؟'' سردار جی نے جواب دیا۔

تو جب خیالی بکری فرضی گلابوں کی کیاری پیٹ بھر کے چر چکی تو ہم نے شفیع عقیل کا ایک نہایت مفصل بے تکلف اور دلچسپ انٹرویو ریکارڈ کیا، جس کے حوالے آپ کو اس مضمون میں جا بہ جا ملیں گے۔ اس کے علاوہ آج سے آٹھ برس پہلے جو مضمون ''مثنویِ سیف الملوک'' کی تعارفی تقریب میں پڑھا تھا، اس کے بھی چند اقتباسات پیش کروں گا۔ شفیع عقیل نے ڈھارس بندھائی کہ آپ خاطر جمع رکھیں، بیش تر حاضرین آپ کی میری عمروں کے ہوں گے اور ان کے حافظے بھی ہمارے جیسے ہوں گے۔ لیکن اب جو سامعین کے شگفتہ و شاداب چہروں پر نظر ڈالتا ہوں تو ہم عمری کے دعوے کی تردید سب سے پہلے میری بیگم ہی کریں گی!

میں نے اپنی دانست میں جو معقول عذر کیے ان میں ایک یہ بھی تھا کہ میں نے تقریب اجراء میں متعارف ہونے والی تینوں کتابوں میں سے ایک بھی نہیں پڑھی۔ کتاب پڑھنے سے پہلے اگر اس پر گفتگو کروں گا تو بالکل الہامی معلوم ہوگی جس پر ضعیف العقیدہ سامعین ایمان نہیں لائیں گے۔ پڑھنے کے بعد جھوٹ بولنے کے لئے دگنی ذہانت درکار ہے۔ جس کا میں دعویٰ نہیں کر سکتا۔ پھر یہ بھی ہے کہ بقول بلھے شاہ:

جوٹھ آکھاں تے کجھ بچدا اے

سچ آکھاں تے بھانبڑ مچدا اے

مطلب یہ کہ جھوٹ بولتا ہوں تو پھر بھی کچھ بچتا ہے، سچ کہہ دوں تو شعلہ بھڑک اٹھتا ہے۔

کتابوں کے مطالعے سے محرومی کا فوری ازالہ تو انہوں نے اس طرح کر دیا کہ دو کتابیں

اسی وقت مرحمت فرمائیں اور تیسری کل رات کو۔ خود صاحبِ کتاب سے ملاقات بڑی باقاعدگی سے ہر پانچویں برس ہو جاتی ہے۔ مرزا کا قول ہے کہ جب کسی دوست یا شناسا سے عرصۂ دراز تک ملاقات نہ ہو تو یقین جانو کہ وہ کراچی ہی میں ہے اور خیریت سے ہے اگر لاہور یا کہیں اور ہوتا تو ضرور ملنے آتا۔ ایک اچھی بات یہ ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح نہیں جانتے۔ اسی لئے ایک دوسری کی بڑی عزت کرتے ہیں۔

شفیع عقیل مجھے "شاہ جی" کہتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی "خاں صاحب" کہہ کر میرے درجات بلند کرتے ہیں۔ میرے عزیز اور بے تکلف دوست مسرور حسن خاں مجھے "سید صاحب" کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ ایک دن میں نے ان سے پوچھا کہ تم مجھے سید صاحب کیوں کہتے ہو؟ فرمایا کہ معاف کرنا، جب یوسفی کہتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا طنز کر رہا ہوں۔ اس لئے کہ حضرت یوسف سے تمہاری نسبت اور مشابہت صرف نام کی حد تک ہے۔ تمہیں دیکھ کر زلیخا کی سہیلیاں کبھی چاقو سے اپنے ہاتھ نہیں کاٹیں گی۔ نیبو ہی کاٹیں گی بلکہ بعض بعض تو نیبو تک کاٹنے سے انکار کر دے گی۔ میں نے شفیع عقیل سے پوچھا، بندہ پرور! آپ مجھے شاہ جی کیوں کہتے ہیں جب کہ میں نے تو حاشا وکلا اپنے سوا کبھی کسی کو گمراہ نہیں کیا؟ فرمایا: خدا کی قسم میں آپ کو شاہ جی احتراماً نہیں کہتا، محض عادتاً کہتا ہوں۔ (یعنی مقصود اس سے عز و عقیدت نہیں مجھے) ڈرائیور، چپراسی اور ماسی کو بھی شاہ جی کہہ کر ہی بلاتا ہوں، وہ تو برا نہیں مانتے۔ زیادہ عرصہ نہیں ہوا دلی میں ایک کانفرنس کے دوران ایک سردار جی سے ملاقات ہوئی۔ میں انھیں بھی شاہ جی کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ بہت خوش ہوتے تھے۔ وقتِ رخصت بغل گیر ہوئے۔ پھر مجھے اپنی ہڈی تو ڑ بھیچی سے release کرتے ہوئے کہنے لگے کہ زندگی میں پہلی بار کسی نے عزت سے پکارا ہے! ورنہ سردار جی! سردار جی! سنتے سنتے میرے تو کان پک گئے۔

اب میں بھی شفیع عقیل کو شاہ جی کہنے لگا۔ خدا اور قارئین گواہ ہیں کہ میں بھی احتراماً نہیں کہتا بلکہ محض تکیۂ تخاطب کے طور پر!

شفیع عقیل نے کبھی اسکول یا کالج میں تعلیم حاصل نہیں کی۔ جس کا واحد سبب وہ غربت اور صرف غربت قرار دیتے ہیں۔ لیکن بے اُستادے کبھی نہیں رہے۔ انھیں وہ استادِ کامل ملا جو شاذ و نادر

ہی کسی کونصیب ہوتا ہے۔ زمانے سے بہتر کوئی معلم اور استاد نہیں۔ کسی دانا کا قول ہے کہ جب آدمی نے جو کچھ پڑھا لکھا تھا وہ سب ذہن سے محو ہو جائے تو جو کچھ بچ رہے گا، اسے تعلیم کہتے ہیں یعنی اگو الف تجھے درکار۔ انہیں بچپن میں سگے ماموں نے اغوا کر کے بیگار لی۔ عرصے تک ان کی بھیڑ بکریاں چراتے رہے۔ عدالت کے ذریعے ان کی بازیابی عمل میں آئی۔ رہائی کے بعد انھوں نے کسی سے دو پیسے ادھار لے کر عید کارڈ خریدا، لیکن جس پڑھے لکھے شخص سے اس پر پتا اور پیغام لکھوانا چاہتے تھے، اس نے ٹال مٹول کی تو انہوں نے کارڈ پھاڑ کر پھینک دیا اور مصمم ارادہ کیا کہ اب میں پڑھ لکھ کر دکھاؤں گا۔ جب کچھ شُد بُد ہوئی تو سڑک پر پڑے ردّی اخباروں کے ٹکڑے جوڑ جوڑ کر پڑھتے رہے۔ فرماتے ہیں کہ جیسے جیسے پڑھنے لگا، یوں محسوس ہوا جیسے زمین سے اٹھتا جا رہا ہوں! ۱۹۴۷ء میں سڑکوں پر لاشیں پڑی ہوتی تھیں اور ٹرینوں سے گاجر مولی کی طرح کٹی ہوئی لاشیں نکلتی تھیں۔ انھوں نے نیشنل گارڈ میں بھرتی ہو کر لاشیں اٹھائیں۔ جنوں کی بوریاں ڈھو ڈھو کر مہاجروں میں راشن تقسیم کیا۔ مدتوں کوڑے کے ڈھیروں میں ٹین ڈبے بوتلیں جمع کرتے رہے۔ جلد سازی سیکھی۔ ایک دوست کی شراکت میں سائن بورڈ پینٹ کرنے کی دکان اس جگہ کھولی جہاں آج کل لاہور ٹی وی اسٹیشن واقع ہے۔ مدتوں بوجھ ڈھوئے۔ سڑک کے کنارے چھابڑی لگائی۔ ان کے والد راج مزدور تھے۔ بیٹے نے بھی ریت نبھائی۔ مزدوری کی اور غربت میں باوقار اور حوصلہ مند رہنے کا جاں گسل ہنر سیکھا۔ ایکٹر بننے کا شوق بھی چرایا۔ فرماتے ہیں کہ میں نے دھندے سارے کیے ہیں۔ ناکام نہیں گزرا۔ ہر کام جم کے کیا۔ رج کے کیا۔

۱۹۵۰ء میں کراچی آئے تو ادیب فاضل کا امتحان پاس کر چکے تھے۔ رختِ سفر میں ایک رجسٹر تھا جس کے افسانے مجید لاہوری کو بہت پسند آئے۔ مئی ۱۹۵۰ء سے ''جنگ'' اخبار میں کام کرنے لگے۔ وفاداری بہ شرطِ استواری کی زندہ و تابندہ مثال ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ مئی ۲۰۰۰ء میں ''جنگ'' اخبار اپنے اس دیرینہ خادم و محسن کی گولڈن جوبلی شایانِ شان طریقے سے منائے۔ انھیں اس زمانے میں ''جنگ'' سے ساٹھ روپے اور رسالہ ''نمک دان'' سے پینسٹھ روپے ماہانہ ملتے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس رقم کو کیسے اور کس مد میں خرچ کریں؟ ایک جھگی میں رہتے تھے۔ صدر

سے پیر الٰہی بخش کالونی کا بس کا کرایہ پانچ پیسے تھا جو وہ افورڈ نہیں کر سکتے تھے۔

چنانچہ ابراہیم جلیس، عزیز کارٹونسٹ اور دو تین دوست مل کر نیو چالی سے کالونی تک گاتے بجاتے، پیدل جاتے۔ بعد کو ایک کھولی میں رہنے لگے۔ ایک رضائی تھی جسے گرمیوں میں بچھا لیتے اور سردیوں میں سب دوست اوڑھ کر سو جاتے تھے۔ ہوٹل والا چار آنے ادھار پر کھانا دیتا تھا۔ اتوار کو ادھار کی "لمٹ" بڑھا کر چھ آنے کر دیتا تھا۔

شفیع عقیل ہر اعتبار سے غیر معمولی انسان ہیں۔ جس عمر میں ہم جیسے گنہ گاروں کو شادی کی خواہش رسماً، شرعاً یا ضرورتاً محسوس ہوتی ہے۔ اس عمر میں ان کو ساری عمر کنوارا رہنے کی بڑی شدت سے خواہش ہوئی جو آج بھی بدستور قائم ہے۔ بھری جوانی میں انہوں نے کنواروں کا ایک کلب بنایا جس میں بہ شمول ان کے، کل تین ممبر تھے۔ اپنی دانست میں یہ لڑکیوں کو رجھانے اور اچنبھے میں ڈالنے کے لئے ایک کیموفلاژ تھا۔ ان کا خیال تھا کہ لڑکیاں ان کا پیچھا کریں گی، مگر ہوا یہ کہ پولس ان کے پیچھے پڑ گئی۔ گویا جو جال انھوں نے مچھلی پکڑنے کے لئے پھینکا تھا۔ اس میں آدم خور مگر مچھ پھنس گیا۔ دو ممبروں کے کنوار پن کا خاتمہ بالخیر وخوبی سامنے فلیٹ میں رہنے والی لڑکیوں کے عشق سے ہوا۔

میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے اس فلیٹ کے باقی ماندہ رومانی امکانات پر توجہ نہیں فرمائی؟

بولے، میں دن بھر چنے کی بوریاں اور مُردے ڈھوتے ڈھوتے اتنا تھک جاتا تھا کہ کسی زندہ کو handle کرنے کے لائق نہیں رہتا تھا!

شفیع عقیل کو گھر میں کبھی بیوی کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ جس کی ایک وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ ان کا بیش تر وقت اپنے گھر میں نہیں گزرتا۔ شادی کے خیال سے انھیں وحشت ہوتی ہے۔ مرزا عبدالودود بیگ مقاہلانہ زندگی یعنی ازدواجی زندگی کو محبت با مشقت سے تعبیر کرتے ہیں اور گرہستی جیون کو جنسی گزر بسر کی ایک شریفانہ، بزدلانہ اور باکفایت شکل قرار دیتے ہیں۔

میں نے دریافت کیا، اس زمانے میں کوئی عشق بھی کیا؟ فرمایا، کیوں نہیں؟ خود سے دُگنی عمر کی ایک سکھنی پر دل وجاں سے عاشق ہو گیا تھا۔ اسے فانی بدایونی کے اشعار سناتا تھا، جن سے وہ

ایسی بدکی کہ ملنا ہی چھوڑ دیا۔ اس کے بعد میں نے بھی فانی بدایونی کے دیوان کو ہاتھ نہیں لگایا۔

اس باب میں ہم نے زیادہ کریدا تو اپنے دریائے شباب کو ایک جملے کے کوزے میں بند کر دیا۔ فرمایا، ''شاہ جی! میں نے ہر مزہ چکھا ہے۔'' وہ کسرِ نفی، سے کام لیتے ہیں۔ مسلسل پچاس سال کے شغل اور ایک عمر کی بد پرہیزی کو اگر محض ''چکھنا'' کہتے ہیں تو ہماری تا حیات محرومی اور حسرت آوارگی کے لئے اردو ڈکشنری میں کوئی لفظ نہیں ملتا۔ ممکن ہے عربی میں ہو۔ عربی کا حوالہ میں نے اس لئے دیا کہ شنید ہے یک زوجیے یعنی ایک ہی بیوی پر قناعت کرنے والے شوہر کو ابوظبہی، دبئی میں ''مسکین'' کہتے ہیں! واللہ مرزا کہتے ہیں کہ دانا منہ بنا کے پیتے ہیں اور نادان پی کے منہ بناتے ہیں۔ ہمارے شاہ جی نے ہر کام ''منہ پھیر کر اُدھر کو، ادھر کو بڑھا کے ہاتھ'' کیا ہے! بچپن میں ہم نے درسی کتاب میں ایک شعر پڑھا تھا جو اس زمانے میں زباں زدِ جوان و نوجوان تھا:

سیر کر دنیا کی غافل زندگانی پھر کہاں
زندگانی گر رہی تو نوجوانی پھر کہاں

شاہ جی نے کرنے اور نہ کرنے کے کاموں کے لئے مناسب وقت اور موقعے کا انتظار نہیں کیا۔ ادھر علالت سے قبل، تقریباً ہر سال، گیارہ مہینے کی جمع شدہ حسرتِ سیر و شکار نکالنے اور فارن ایکسچینج کا سالانہ کوٹا ٹھکانے لگانے یورپ جاتے اور نت نئے مشاہدات و تجربات کی سوغات سے لدے پھندے لوٹتے تھے۔ ابنِ انشاء مرحوم یاد آتے ہیں۔ وہ جہاں بھی جاتے، گڑیاں ضرور خرید کر لاتے تھے۔ دوستوں کو دکھا کر بچوں کی طرح خوش ہوتے اور سفرنامہ پڑھنے کی تلقین کرتے۔

شاہ جی تا دمِ تحریر کنفرمڈ کنوارے ہیں۔ ان کی سدا سہاگن جوانی سے توقع نہیں کہ شادی کا تکلف کر کے خود کو خواہ مخواہ تکلیف میں مبتلا کریں گے۔ کنوارے ہیں۔ کنوارے ہی رہیں گے۔ لیکن کیسے کنوارے؟ ایسے ویسے؟ وقت کم ہے اور محفل میں خواتین بھی موجود ہیں، لہٰذا صرف اتنا عرض کرنے کی اجازت چاہوں گا کہ اگر وہ عورت ہوتے تو کبھی کی ''کاروکاری'' ہو چکی ہوتی۔ یہ بات میں الزام یا بہتان طرازی کے طور پر نہیں کہہ رہا، کاروکاری کی مذمت مقصود ہے، بڑی بُری رسم ہے۔

پسند ناپسند کا ذکر آیا تو کہنے لگے، ''کتاب سے عشق ہے، بہت پڑھتا ہوں۔ مگر زندگی

میں کبھی کوئی کتاب دوبارہ نہیں پڑھی۔ افسانے نہیں پڑھتا، ناول سے ہول آتا ہے، نان فکشن پڑھتا ہوں، جب تک زندہ ہوں، پڑھتا لکھتا رہوں گا۔''

ادبی تقریبوں اور جلسوں میں نہیں جاتے، فرماتے ہیں، ''صرف اپنے فنکشن میں جاتا ہوں۔'' غالباً اس لئے کہ اس میں انھیں طوعاً وکرہاً تالی نہیں بجانی پڑتی۔

میں نے پوچھا، ''شاہ جی، آپ کو بال کس رنگ کے پسند ہیں؟'' بولے، ''کسی بھی رنگ کے ہوں، میں تعصب نہیں برتتا، بس سفید نہ ہوں۔''

سوال:۔ ''آپ کو کراچی میں رہتے پچاس برس ہو گئے۔ اب آپ کو شہر زندہ دلاں لاہور کیسا لگتا ہے؟''

جواب:۔ ''خود کو اجنبی محسوس کرتا ہوں۔ لیکن جہاں جہاں بچپن میں مصیبتیں جھیلیں اور مشقتیں اٹھائیں، جہاں چھابڑی لگائی، بوجھ ڈھوئے...... وہ سب جگہیں مجھے پہچانتی ہیں۔ دُور سے اشارے کر کر کے بلاتی ہیں۔ لاہور میں اگر ایک گھنٹے بھی قیام کروں تو تین مقامات پر ضرور حاضری دیتا ہوں۔ داتا صاحب، میاں میر صاحب، اور شاہ حسین۔''

''آپ ان تین آستانوں پر ایک گھنٹے میں کیسے پہنچ جاتے ہیں؟'' میں نے چھیڑا۔

''یہ بھی بزرگوں کا فیضان ہے۔'' انہوں نے مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے فرمایا اور منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

سوال:۔ ''آپ نے دنیا دیکھی ہے، مے خانہ نشینی سے ترقی کرتے کرتے خانہ نشینی پر اُتر آئے ہیں۔ اپنی عمر کے کس حصے کو آپ بہترین دور گردانتے ہیں؟''

جواب:۔ ''لااُبالی پن والا زمانہ جب میں جھگی میں رہتا تھا!''

یہ دعویٰ عاجزانہ اور اعتراف فاخرانہ شاہ حسین اور بلھے شاہ کا شیدائی ہی کر سکتا ہے۔ انہوں نے کچھ غلط نہیں کہا۔ انہوں نے صحیح معنوں میں ساری عمر عیش کیا ہے۔ غالبؔ نے تفتہؔ کے نام ایک خط میں عیش کی جو تعریف کی ہے وہ اس باب میں حرفِ آخر کا درجہ رکھتی ہے۔ لکھتے ہیں، ''سنو صاحب، جس شخص کو جس شغل کا شوق ہو اور وہ اس میں بے تکلف عمر بسر کرے، اس کا نام عیش ہے۔''

شاہ جی نے اس عیشِ فراواں میں اپنے پڑھنے والوں کو بھی برابر شریک رکھا ہے۔

زندگی کے مصائب وشدائد ان کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ فالج تک ان کے قہقہے کی گونج اور گمک کو دھیمی نہ کر سکا۔

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام
ایک عقد ناگہانی اور ہے

ایک ہفتے قبل ملاقات ہوئی تو میں نے کہا کہ آپ کو چاق وچوبند دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔ بولے، ہاں، بالکل نارمل ہوں۔ بس ذرا تیز نہیں چل سکتا۔ میں نے کہا کہ جو لوگ روزانہ صبح سویرے ساحلِ سمندر اور پارکوں میں تیز قدمی کا مظاہرہ کرتے ہیں، انھیں اپنی ٹانگوں کے حسنِ کارکردگی پر کون سا صدارتی ایوارڈ یا اولمپک گولڈ میڈل ملتا ہے؟

فرمایا، ''شاہ جی! ہم دونوں ہی سچ کہتے ہیں۔''

یہ کہا اور ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ ان کے قہقہے کیلئے انگریزی لفظ belly laugh سے بہتر کوئی لفظ نہیں ملتا۔ یعنی ایسا قہقہہ جو منہ، حلق یا فقط ساؤنڈ باکس سے نہیں بلکہ معدے کی گونجیلی گہرائیوں سے نکلتا ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ لوگ اپنے لطیفے اور فقرے کی داد خود ہی اس طرح دیتے اور طلب کرتے ہیں کہ قہقہے کے بعد اپنا زانو پیٹتے اور سیدھا ہاتھ پھیلا دیتے ہیں تاکہ دوسرا اس پر ہاتھ مار کر داد دے۔ شاہ جی کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ یہ دوسرے کے فقرے پر بھی اپنا ہاتھ پھیلا کر دادِ سماعت وصول کرتے اور پرایا زانو پیٹتے ہیں۔ مطلب یہ کہ دوسرے کے فقرے کو اپنا فقرہ اور دوسرے کی ران کو اپنی ران سمجھ کر پیٹ پیٹ کر لال کر دیتے ہیں۔

''بیلی لاف'' پر یاد آیا کہ میں نے انٹرویو کے دوران پوچھا، ''آپ کو ڈانس کون سا پسند ہے؟'' بولے، ''Belly Dance۔''

میں نے کہا، ''شاہ جی! یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ اس لئے کہ بیلی ڈانس میں فقط پاپی پیٹ ناچتا ہے۔ باقی وجود دیکھتا رہ جاتا ہے۔''

فرمایا، ''شاہ جی! ہم دونوں ہی سچ کہتے ہیں۔''

اس مردِ مجرد کے ایام جوانی کا قصہ ہے۔ ۱۹۵۲ء میں انہوں نے جنسی افسانوں کا ایک سلگتا بھبکتا مجموعہ شائع کیا، جس کا نام ''بھوکے'' تھا۔ فرماتے ہیں ''نام بدل بدل کر ہر افسانے میں بھوکا میں ہی تھا!'' واضح ہو کہ بھوک دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک وہ جو گنتی کے نوالے حلق سے اُتارنے کے بعد مٹ جاتی ہے۔ دوسری زیادہ شدید بھوک وہ جو یہ نوالے ہضم ہونے کے بعد خونِ صالح سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ انسان کی دوسری بھوک اور پہلی پیاس ہے۔ اس مجموعے کی اشاعت پر زیر دفعہ ۱۹۲ تعزیرات پاکستان فحاشی کا فوج داری مقدمہ ثریا بیگم، مجسٹریٹ کی عدالت میں چلا۔ گواہانِ صفائی کی فہرست میں شورش کاشمیری، سعادت حسن منٹو، مولانا عبدالمجید سالک اور دیگر بڑے ادیب تھے جن کو عدالت میں پیش کرنا شفیع عقیل کے بس کی بات نہ تھی۔ اکابرین کی یہ فہرست تو کہاوت والی مینڈکوں کی پنسیری ثابت ہوئی جو کبھی پوری نہیں ہوتی۔ مینڈک انصاف کی ترازو سے پھدک پھدک کر نکل جاتے تھے۔ نتیجہ یہ کہ عدالت نے چھ ماہ قید اور ایک ہزار روپے جرمانے کی سزا سنادی۔

میں نے پوچھا، ''آپ پہلے ادیب ہیں جسے عریانی اور فحاشی کے جرم میں چھ ماہ کی قید کی سزا سنائی گئی۔ کیا آپ کے خیال میں آپ کے ساتھ زیادتی ہوئی؟''

بولے۔ ''نہیں۔ ناانصافی قطعاً نہیں ہوئی۔ وہ افسانے تھے بھی اسی لائق کہ مصنف کو جیل بھیج دیا جائے۔''

اڑتالیس سال گزرنے کے بعد اس سزا پر شاہ جی کا واحد اعتراض یہ تھا کہ صرف تین مہینے کی ہونی چاہیے تھے جو کسی بھی amateur اور سیکنڈ ہینڈ فحش نگار کے جوشِ جوانی کو اعتدال پر لانے کے لئے کافی ہوتی۔

جوانی کے سارے کام انھوں نے نوجوانی میں ہی نمٹا دیے جو بھولے بھٹکے اتفاقاً باقی رہ گئے انھیں پیری کی پختہ کاری کے لئے اٹھا رکھا۔ کچھ بچے وقت سے پہلے جوان ہو جاتے ہیں اور کچھ لوگ عین جوانی میں بڑھاپے کو اپنے اوپر طاری کر لیتے ہیں۔ عمرِ رواں کا شدید احساس انھیں تنگ جوتے کی طرح ہمہ وقت کاٹتا رہتا ہے۔ ہم بعض ایسے شاعروں سے واقف ہیں جو مدت العمر سے شدت العمر میں مبتلا ہیں۔ چند ایسے بھی ہیں جن کی ایامِ جوانی کی شاعری میں ذم کا پہلو جھلکتا ہے اور عہدِ پیری کے

اشعار سے زم زم چھلکتا ہے؟ لیکن کچھ شاعر اور ادیب ایسے ہو گزرے ہیں جن کے لفظ کی امر جوانی پر بڑھاپے کے سائے کبھی نہیں پڑے۔ گردشِ لیل و نہار ان کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔ چشمِ تصور خیام اور حافظ شیرازی کو بڑھاپے کے روپ میں دیکھنے سے قاصر ہے۔ اس کا اطلاق ممتاز مفتی اور ضمیر جعفری کے سدا بہار قلم پر بھی ہوتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ شفیع عقیل کی تحریر بھی نکھرتی، اُجلتی اور سنورتی جاتی ہے...... موقع و محل دیکھ کر چٹکی لینے اور اٹھلانے کو بھی گناہ نہیں سمجھتی۔

پنجابی لوک کہانیوں اور پنجابی کے قدیم شعراء کے ترجمے جس لگن اور للک سے شفیع عقیل کم و بیش ربع صدی سے کرتے رہے ہیں، وہ دونوں زبانوں سے ان کی شیفتگی اور عہدِ وفا کی استواری کا ثبوت ہیں۔ ان کے منظوم ترجموں کی نظر پار (see through) چلمن سے متن کا اصل حسن لشکارے مارتا ہے۔ ترجمے کی دشواریاں کچھ مترجم ہی جانتے ہیں۔ اپنی زبان میں، کسی دوسرے کا مدعا، کسی تیسرے شخص کو سمجھانا قلم جوکھم کا کام ہے۔ اس کا نتیجہ بالعموم دہرے، تہرے قتل کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ کچھ ترجمے ایسے بھی ہوتے ہیں جو اصل سے زیادہ مقبول ہوتے ہیں، جیسے فٹز جیرالڈ کا رباعیاتِ خیام کا انگریزی ترجمہ۔ ناگوارِ خاطر نہ ہو تو عرض کروں کہ مجھے تو انگریزی ترجمہ اصل سے بہت بہتر معلوم ہوتا ہے۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مجھے فارسی نہیں آتی۔

اس کے برعکس بعض اوریجنل (طبع زاد) تخلیقات ایسی ہوتی ہیں جن میں ترجمے کی شان پائی جاتی ہے۔ جیسے مخدومی و مکرمی جناب عبدالعزیز خالد کا کلام۔ جب تک آدمی فاضلِ اجل اور عالمِ بے بدل نہ ہو۔ اور جب تک چار پانچ زبانوں میں مہارتِ تامہ نہ رکھتا ہو۔ یہ انتہائی نادر و نایاب خصوصیت کلام میں پیدا نہیں ہوتی۔ ایسے ترجمے کی ایک خوبی یہ ہوتی ہے کہ جب تک اس کا بھی مزید ترجمہ نہ کیا جائے، اصل خرابی واضح نہیں ہوتی۔ تفنن برطرف، جب تک ہماری طرح آپ کو بھی چار پانچ زبانوں سے گہری ناواقفیت نہ ہو، آپ ان کے کلام کی داد نہیں دے سکتے۔

شعر کی خوبی یہ ہے کہ شعر ہی معلوم ہو، اس پر ہماری نثر کا گمان نہ ہو۔ جب کہ ترجمے کی خوبی یہ ہے کہ ترجمہ نہ معلوم ہو۔ جناب شان الحق حقی نے انٹونی اینڈ کلوپیٹرا کا دلّی کی بامحاورہ زبان میں جورواں دواں اور چٹخارے دار ترجمہ کیا ہے۔ وہ اپنی جگہ ایک شاہکار سے کم نہیں بلکہ بعض صائب

الرائے احباب کا خیال ہے کہ شیکسپیئر کے متن سے بہتر ہے۔ جیسا کہ آپ کے علم میں ہوگا، ہم اس عہد کے سب سے بڑے زباں داں سے اصلاح لیتے رہے ہیں اور انھیں اپنا استاد و مرشد جانتے ہیں۔ لہٰذا اگر ہم یہ کہیں کہ ان کا ترجمہ اصل سے بہتر ہے تو اندیشہ ہے کہ ہمارے بدخواہ اسے شاگردانہ خوشامد (جسے پروفیسر قاضی عبدالقدوس ایم اے، بی ٹی تملق متعلمانہ کہتے ہیں) تصور کریں گے۔ لیکن اتنا ہم ضرور کہیں گے کہ شیکسپیئر اگر اردو میں لکھتا تو بلینک ورس میں لاکھ زور مارتا ہمارے استاد سے بہتر نہیں لکھ سکتا تھا بلکہ ہماری طرح اصلاح لینے کے بعد بھی اپنا گستاخ سفید فام زانوئے تلمذ تہ کیے بیٹھا رہتا۔ تا آنکہ زانو سن ہو جاتا اور وہ تعظیم دینے کے لئے اُٹھنے کے لائق بھی نہ رہتا۔

مثنوی ''سیف الملوک'' کے مبسوط اور محققانہ مقدمے سے اس جگر کاری اور عرق ریزی کا اندازہ ہوتا ہے جو متن کی صحت، تدوین اور تلخیص کی خاطر گوارا کی گئی۔ کوئی ماخذ ایسا نظر نہیں آتا جسے انہوں نے کھنگالا نہ ہو۔ رواں اور برجستہ ترجمے میں انھوں نے کہیں بھی لطف کو لفظ پر قربان نہیں کیا۔ تحقیق و تدقیق ہمارا میدان نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ کسی بھی چھوٹے یا بڑے میدان سے ہمارا واسطہ نہیں رہا۔ ہم تو ان میں سے ہیں جن کی درماندگیِ شوق ایک چھوٹی سی پناہ تراش کر آسودہ ہو جاتی ہے۔ ساری زندگی اعداد و شمار اور گنتی سے سروکار اور شغف رہا ہے۔ چنانچہ ہم نے گن کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ مقدمے میں ا۲۷ سنین کے حوالے دیے گئے ہیں۔ اسی پر قیاس کر لیجئے کہ تصنیفات و واقعات کی صحت اور تعینِ زمانی کے ضمن میں انھوں نے کتنی اور کیسی محنت کی ہوگی؟ انہوں نے بہ کمالِ صحت و لطف ترجمہ کیا ہے، اور جم کر دادِ تحقیق دی ہے۔ انہوں نے ایسا کارنامہ انجام دیا ہے جو مستقبل میں ایک معتبر حوالے اور سند کا درجہ پائے گا۔

میاں محمد بخش کی مثنوی عظیم کلاسیک کا درجہ رکھتی ہے، جو ہمارے تہذیبی ورثے کا گراں قدر حصہ ہے۔ یہ ایک شہزادے کی داستان ہے جو لوک۔ لہجے میں بیان کی گئی ہے۔ ظاہر ہے، ''سیف الملوک'' کو کلام الملوک تو نہیں کہیں گے لیکن اس کے ملوک الکلام ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ پنجابی شعر و ادب اور لوک کہانیوں کی اشاعت دونوں زبانوں کی تفہیم و ترویج کے عمل کو تیز کرنے میں مددگار ثابت ہوگی۔ مستقبل کی اردو کا لب و لہجہ، آہنگ، محاورہ اور روز مرہ وہی ہوگا جو اس کے بولنے اور برتنے والوں کا ہوگا۔ پاکستانی زبانوں کے کلاسیکی ادب کے تراجم، اردو بولنے، لکھنے اور پڑھنے والوں

کو اساطیری تلمیحات، صدیوں پرانی لوک، روایات، امثال اور imagery کے نو دریافت خزانوں سے روشناس کرائیں گے۔ اردو ان صحت مند نامیاتی اضافوں کو خوش دلی اور خندہ جبینی کے ساتھ جزوِ زباں بنانے کی صلاحیت رکھتی ہے اور ماضی میں اس کا ساختیاتی ارتقا اس کی فطری لچک اور انجذابی اور ایجابی صلاحیتوں کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ یہ کسی بوسیدہ دیوار پر قدیم آرائشی اینٹیں لگانے کا عمل نہیں بلکہ ایک لچک دار شاخ پر دوسری ہری بھری جیتی جاگتی شاخ کی قلم لگانے کی ابتداء ہے جو دونوں کی بقا اور پھولنے پھلنے کی ضامن ہے۔

خدائے حی وقیوم ان ہاتھوں کو سلامت باکرامت رکھے جو اس ثمر یک رنگ د چہار رس کے سدا بہار شجر کی آبیاری میں دل و جاں سے منہمک ہیں۔

ایک زیرک صحافی کی چشمِ نم سے شفیق صاحب نے پچاس برسوں میں کوئی بیس حکومتوں کو دھوم دھڑ کے سے بنتے، بڑھکیں مارتے اور بے عزتی سے رخصت ہوتے دیکھا ہے۔ حیف در چشم زدن شہرت من آخر شد۔ اور ایک انھی پر موقوف نہیں ساری قوم جاگتی آنکھ سے خواب دیکھتی اور سوتی آنکھ سے حالاتِ حاضرہ کا مشاہدہ کرتی رہی ہے۔ مرزا عبدالودود بیگ حالؔی کا سوا سو سال پرانا مگر حسب حال شعر دوسرے مصرعے میں تصرف کے ساتھ اکثر پڑھتے ہیں:

آنکھ سب ایک کھلی رکھتے ہیں اور ایک مُندی
اس میں سندھی ہیں، مہاجر بھی ہیں، پنجابی بھی

جب دو آنکھیں زائد از ضرورت معلوم ہونے لگیں اور ایک آنکھ سے دیکھنے کی عادت پڑ جائے تو تسلیم و رضا کا شیوہ اتنا پختہ اور ایمان اتنا مضبوط ہو جاتا ہے کہ ذاتی نالائقی بھی من جانب اللہ معلوم ہوتی ہے۔

صحافت اور "جنگ" سے ان کی پیشہ وارانہ اور جذباتی وابستگی نے پچاس بہاریں دیکھی ہیں:

یہ نصف صدی کا قصہ ہے، دو چار برس کی بات نہیں

جو کام بھی انھیں تفویض ہوا یا صحافت اور تصنیف و تالیف کا جو شعبہ یا عنوان انھوں نے اپنے لیے تجویز کیا، اس کی بجا آوری اور تکمیل میں اپنی تمام تر صلاحیتیں بروئے کار لائے۔ ان کی لگن، تن دہی اور جگر کاری کا ثبوت پچیس کتابوں کے علاوہ وہ بکھرے ہوئے مضامین بھی ہیں جو کتابی شکل

میں شائع نہیں ہوئے۔ ان کے ذاتی خزینے میں نادر پینٹنگز اور ان پر وہ مضامین بھی شامل ہیں جو وہ وقتاً فوقتاً لکھتے رہے۔ انہوں نے صحافت کی تاریخ کے سارے نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ فراز کم، نشیب زیادہ۔ اور اس سے بھی بدتر، جمود و بے ضمیری کا چٹیل اور بے برگ و بار پلیٹو۔ انہوں نے ظفر علی خاں، چراغ حسن حسرت اور عبدالمجید سالک کا آخری دور دیکھا۔ ڈھلتے سورج کی تابش و تابنا کی کو جذب کیا۔ پھر نیرنگیِ دوراں نے وہ دن بھی دکھائے جب صحافت میں حبِ جاہ و زر کی قلم لگائی گئی جسے عرفِ عام میں ''لفافہ جرنلزم'' کہتے ہیں۔ شاہ جی اس گلشنِ پر خار سے خود کو زخمائے بغیر بے نیازانہ گزر گئے۔ سیاست کی کثافت اور Polarization کی مخربِ اقدار کشش سے کتنے صحافی اور کالم نویس ہیں جو خود کو بچا سکے ہیں ان حالات میں حکومتیں اگر Fourth Estate کو اپنا زرخرید ترجمان و تابعِ فرمان بنانا چاہیں تو تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ صحافی ہو یا سیاست داں، جج ہو یا بینکر اور بیوروکریٹ...... یہ سب اسی ترکیب سے ''پکڑائی'' دیتے ہیں۔ جس طرح بعض علاقوں میں بندر پکڑے جاتے ہیں۔ وہ طریقہ یہ ہے کہ ناریل میں اتنا سوراخ بنا دیا جاتا ہے کہ صرف بندر کا پنجہ اندر جا سکے۔ بندر نرم و شیریں کھوپرے کے لالچ میں اس میں ہاتھ ڈال دیتا ہے اور مٹھی میں بہت سا کھوپرا بھر لیتا ہے۔ لیکن بھری مٹھی کو تنگ سوراخ سے نہیں نکال پاتا۔ مٹھی کھول کر کھوپرا چھوڑنے اور ہاتھ چھڑانے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا۔ لہٰذا اسی طرح ایک ہاتھ ناریل میں پھنسائے تین پایہ بنا لنگڑاتا پھرتا ہے اور آسانی سے پکڑا جاتا ہے۔ پھر ساری عمر مداری کی ڈگڈگی اور اشاروں پر قریہ قریہ، گلی گلی اُچھل کود کر دکھاتا ہے اور ہاتھ پھیلا کر پیسے بٹورتا ہے۔ مداری اگر رحم کھا کر اسے جنگل میں آزاد چھوڑ بھی دے تو واپس آجاتا ہے اور کسی نئے مداری کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے۔

سو یہی حال ان حضرات کا ہوتا ہے، جن کے معزز پیشوں کے نام ابھی اوپر گنوائے گئے ہیں۔ صحافیوں کی تخصیص نہیں۔ ایں خانہ ہمہ داغدار است۔ پھر بدگمانی اور شک و شبہ سے مملو ایسی فضا پیدا ہو جاتی ہے جس میں اگر کوئی شخص حالیہ بارش یا نئی فصل کے خربوزے کی بھی تعریف کرے تو اسے حکومت کا آدمی سمجھا جاتا ہے۔ ایک زمانے میں تو بے توقیری اتنی بڑھ گئی کہ حکومت نے صحافیوں کو بے اثر و بے ضرر جان کر انہیں پکڑنا ہی چھوڑ دیا جس سے ان کی بڑی ہیٹی ہوئی۔

پس نوشت

اس مضمون کے چیدہ چیدہ حصے بطور ۴/ا خطبۂ صدارت، شمیع عقیل صاحب کی تین کتابوں کی تقریبِ اجرا میں پڑھے گئے۔ اس کے چند روز بعد وہ غریب خانے پر تشریف لائے اور میرے سہو وتسامح کی، جسے غلط بیانی کہنے میں ان کی شائستگی مانع تھی، نشان دہی کی۔ ایک پرچہ میرے حوالے کیا جس پر چار قابلِ اصلاح و نا قابلِ درگزر غلطیوں کی وضاحت کی تھی جو ان کے الفاظ میں کچھ یوں ہیں۔

ا۔ ''آپ نے لکھا ہے کہ میں افسانے نہیں پڑھتا' جب کہ میں نے کہا تھا 'میں آج کل افسانے نہیں پڑھتا۔''

یہ واقعی بڑا باریک فرق ہے، مثلاً کوئی ملزم یہ کہے کہ میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ ''میں قتل نہیں کرتا'' بلکہ یہ کہا تھا کہ ''میں آج کل قتل نہیں کرتا'' تو عدالت اسے بری کرنے سے پہلے دس دفعہ سوچے گی۔

۲۔ تجھ سے بچھڑ کر زندہ ہیں
جان بہت شرمندہ ہیں

''آپ نے یہ شعر افتخار عارف کے حوالے سے لکھا ہے، یہ عبیداللہ علیم کا ہے۔''

عرض ہے کہ یہ شعر افتخار صاحب کے پہلے مجموعے ''مہر دو نیم'' میں موجود ہے۔ وہ بہت محتاط اور دیانت دار آدمی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اپنے دیوان میں شامل کرنے سے پہلے انہوں نے پوری طرح اطمینان کر لیا ہوگا کہ یہ شعر انہیں کا ہے۔

جب یہ کتاب چھپ رہی تھی تو میں نے لندن میں افتخار عارف سے کہا تھا کہ عزیزم! یہ شعر حذف کر دو۔ اس لئے کہ تمہارے ذہین و شاداب چہرے پر مجھے شرمندگی کی کوئی رمق نظر نہیں آتی بلکہ تازہ فتوحات کی علامات ہویدا ہیں۔ مزید برآں، محض زندہ بچ جانے پر شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ جوان آدمی کے لئے شرمندہ ہونے کا کوئی نامعقول جواز ضروری ہے۔

جہاں دیدہ ہیں۔ بولے، بلاوجہ شرمندہ پھرنے سے دوسروں کی انا کی تسکین ہوتی ہے۔

۳۔ کھڑکیوں میں کھڑی ہونے والی لڑکیوں اور کنوارا کلب کے واقعات گڈمڈ ہو گئے

ہیں۔ لڑکیوں کا قصہ ۱۹۴۸ء کا ہے اور لاہور میں دکان کے حوالے سے ہے۔ جب کہ کنوارا کلب ہم نے ۱۹۵۲ء میں کراچی میں بنائی تھی۔"

مجھے واقعی افسوس ہے کہ میں نے لاپروائی سے لذتِ آوارگی کو نحوستِ تجرّد سے خلط ملط کر دیا۔

ان کی وضاحت سے ثابت ہوتا ہے کہ اپنی آزادہ روی اور آوارگی کے بیان میں بھی وہ طریقہ دجائے واردات اور سنین وغیرہ کی صحت کا اتنا ہی خیال رکھتے ہیں جتنا کہ مرحوم شاعروں کی زندگی پر خشک تحقیق کے دوران چھان پھٹک سے کام لیتے ہیں۔

۴۔"بھیڑ بکریوں کے بجائے مویشی چرانا ہے۔"

اس التباس کا اعتراف لازم ہے۔ مرزا عبدالودود بیگ نے بھی ہمیں ڈانٹا کہ تمہیں اتنا بھی معلوم نہیں کہ چرواہوں اور قصائیوں کی Snobbery میں بڑا فرق ہے۔ بھیڑ بکری کا گوشت بیچنے والا قصائی گائے بھینس کا گوشت بیچنے والے قصائی سے برتر اور زیادہ معزز سمجھا جاتا ہے۔ اس کے برعکس گائے بھینس چرانے والا چرواہا، بھیڑ بکری چرانے والے گڈریے پر فوقیت رکھتا ہے۔

ہمیں اس کا علم نہیں تھا۔ اس لئے کہ ہمیں تو بچپن میں صرف مرغیاں چگانے اور انھیں ہنکال کر دربے میں بند کرنے کا تجربہ ہے۔ اللہ جانے اس درجہ بندی میں ہمیں کس سیڑھی پر کھڑا کیا جائے گا۔ مرزا نے یہ بھی کہا کہ تم نے لکھا ہے کہ "میں (یعنی شاہ جی) بکریاں چراتا رہا۔" جب یہ مضمون چھپواؤ تو ازراہِ کرم چُراتا کی چ پر زبر ضرور لگوانا، جلی قلم سے۔ یہ اس لئے اور بھی ضروری ہے کہ آگے چل کر تم نے لکھا ہے کہ شاہ جی کو چھ ماہ کی سزائے قید ہوئی۔ جس طرح بعض لکھنے والے واقعات کو خلط ملط کر دیتے ہیں، اسی طرح کچھ پڑھنے والے اعراب ادھر کے اُدھر کر دیتے ہیں۔ زیر کی جگہ زبر اور زبر کی بجائے پیش لگا دیتے ہیں!

خطبہ ☆

جنابِ صدر، محترم اراکین بورڈ آف گورنرز، عزیزانِ گرامی، معزز خواتین و حضرات!

آپ نے مجھ جیسے شخص کو جو ایک مدت سے ادبی اعتکاف میں ہے، اس تقریبِ سعید میں دعوتِ کلام دے کر میری توقیر بڑھائی ہے۔ تہِ دل سے سپاس گزار ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ مسرت کے ساتھ ساتھ حیرت بھی ہوئی۔ میری حیرت اور اندیشہ ہائے دور و دراز کو آپ کے ایگزیکیٹو ڈائریکٹر جناب شاہد عزیز صدیقی نے ایک بے ساختہ جملے سے دور کر دیا۔ فرمایا کہ ہم کبھی کسی صاحبِ اقتدار یا وزیر با تدبیر یا معزز سرکاری افسرِ تن بہ تقریر کو زحمتِ کلام نہیں دیتے۔ میں نے عرض کیا کہ میں تو اپنے کیریئر کے آخری مرحلے میں، جس کا گراف دل کے مریض کا ECG معلوم ہوتا تھا، سرکارِ بے سروکار کا افسرِ نامدار بھی رہ چکا ہوں۔ انہوں نے یہ کہہ کر میرا بے جا تردد دور کرنا چاہا کہ جو افسر ریٹائر ہو گئے یا ڈِسمس کر دیے گئے، ان کا شمار ہم اعلیٰ افسروں میں نہیں کرتے! اس وضاحت کے بعد اس عزت افزائی کا سبب کچھ کچھ ہماری سمجھ میں بھی آنے لگا۔

حضرات! آج کل بیوروکریٹس اور بینکرزیوں بھی بہت بدنام ہیں لیکن ان سے بھی بدتر ایک اور کلاس ہے، وہ ہے ریٹائرڈ بیوروکریٹس اور بینکرز کی برادری، جس سے اب اس عاجز کو قریبی نسبت ہے۔ ہمارے ہمدمِ دیرینہ مرزا عبدالودود بیگ تو ایک اور ستم ڈھاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ بیوروکریٹس کے املا میں کریٹ کی یے کے نیچے دو کے بجائے تین نقطے لگا دیے جائیں تو املا کی غلطی دور ہو جائے گی لیکن انھیں یہ خیال نہ آیا کہ ہماری دل شکنی کی صورت بھی پیدا ہو جائے گی۔ زیادہ عرصہ

☆ یہ مضمون انڈس ویلی اسکول آف آرٹ اینڈ آرکی ٹیکچر کے جلسہ تقسیم اسناد کے موقع پر (۱۴ دسمبر ۲۰۰۲ کو پڑھا گیا)

نہیں ہوا مجھے بیوروکریسی کے گڑھ اسلام آباد میں..... مگر غولِ بادشاہ گراں کی غلام گردشوں سے دور ایک جلسے کی صدارت کا شرف حاصل ہوا جس میں وزیرِ داخلہ اور سینئر بیوروکریٹس بھی رونق افروز تھے۔ میں نے تمہیداً عرض کیا کہ اس سیاسی دارالخون خرابہ میں آنے میں مجھے کافی تامل ہوتا ہے۔

وجہ یہ کہ اسلام آباد درحقیقت جنت کا نمونہ ہے۔ جنت کا نمونہ اس اعتبار سے کہ یہاں جو بھی آتا ہے، حضرت آدم کی طرح نکالا جاتا ہے۔

میرا خیال تھا اور ہے کہ مجھے اسکول آف آرٹ اینڈ آرکیٹکچر میں کسی مشفقانہ غلط فہمی کی بنا پر دعوتِ کلام دی گئی ہے۔ وگرنہ کہاں میں کہاں یہ کلام اللہ اللہ! جیسا کہ میں نے ابھی اشارتاً عرض کیا، میرا دل رکھنے اور قدر و منزلت بڑھانے کے لئے اس سے زیادہ اور کیا تعریف ہو سکتی ہے کہ:

تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ سود خوار ہوتا!

آرٹ میں اپنے درک اور دسترس کے بارے میں چند ذاتی گزارشات آغازِ گفتگو میں ضروری سمجھتا ہوں۔ اس لئے کہ طالب علموں اور خوردوں کے سامنے جھوٹ بول کر دروغ گوئی کا دستاویزی ثبوت فراہم نہیں کرنا چاہتا۔ چوتھی جماعت میں چار دن فارسی پڑھنے کے بعد میں آمد، آمدی، آمدم، آمدید اور شد، شدی، شدم، شدیم، شود اور شدہ کی گردان سے ایسا وحشت زدہ ہوا کہ آنکھ بند کر کے ڈرائنگ لے لی اور آگے چل کر ثابت ہوا کہ میٹرک تک ڈرائنگ کے دوران بھی بند ہی رکھی۔ فارسی سے قریب قریب نابلد ہونے کے باوجود میں کیسی اردو لکھتا ہوں، اس کا اندازہ اس واقعے سے لگایئے کہ شادی کی ایک تقریب میں کراچی گریمر اسکول کے ایک لڑکے نے پوچھا، ''انکل! کیا آپ کو آسان اردو لکھنے میں بہت دقت ہوتی ہے؟'' میں نے کہا، ''برخوردار، یہ خیال کیسے آیا؟'' بولا، ''آپ کی وجہ سے گریمر اسکول کے لڑکے اردو میں فیل ہوتے ہیں!'' ڈرتا ہوں کہ چائے کے وقفے میں عزیزانِ آرٹ اسکول کہیں مجھ سے یہی کذب سوال نہ کر بیٹھیں۔ غنیمت ہوئی کہ میں نے فارسی صرف چار دن پڑھی۔ اگر تین چار دن اور پڑھ لیتا تو مجھے یقین ہے کہ کراچی گریمر اسکول کے لڑکے برسوں او (O) لیول ہی میں قلابازیاں کھاتے اور مجھے انگریزی میں کوستے رہتے۔

خیر، یہ تو گریمر اسکول پر جملہ معترضہ تھا۔ بات آرٹ اور ڈرائنگ کی ہو رہی تھی۔ عزیزو!

آٹھویں جماعت تک تو جیسے تیسے گزر ہو گئی۔ کیونکہ میں گھڑا اور انگور کا خوشہ اچھا خاصا بنا لیتا تھا لیکن نویں دسویں کلاس میں پہنچ کر یہ واضح ہو گیا کہ میری تمام تر آرٹسٹک مہارت اور صلاحیتیں گھڑے اور انگوروں کے گچھے پر ختم ہو گئیں۔ ہندو ڈرائنگ ماسٹر کہتا تھا کہ تمہارا گھڑا کاغذ پر تو پھر بھی پہچان لیا جاتا ہے، اس لئے کہ تم اس کے نیچے خوبصورت حروف میں لکھ دیتے ہو کہ یہ گھڑا ہے! لیکن اگر کوئی کنواری کنیا یعنی دوشیزہ ایسے اَن گھڑ گھڑے کو سر پر رکھ کے پنگھٹ پہ پانی بھرنے جائے تو من چلے لونڈے آدھے رستے میں ہی غلیل سے گھڑے کو ڈھیر کر دیں گے اور گوری وہیں کھڑی گھونگٹ کے پٹ کھول کے مسکرائے گی۔

بھلا ہوا مری گگری ٹوٹی

پنیا بھرن سے چھوٹی

ڈرائنگ ٹیچر نے ترس کھا کر یہ مشورہ دیا کہ تم اتوار کو میرے گھر آ کر ڈرائنگ کی مشق کیا کرو، دو تین اور غبی لڑکے بھی آتے ہیں۔ چنانچہ میں پابندی سے وہاں بھی چٹائی پہ زانوئے تلمذ تہ کرنے لگا۔ ڈیڑھ سال کی شاگردی کے بعد میں کس درجۂ کمال پر پہنچا۔ اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ ایک دن اُستاد نے اپنی ایک واٹر کلر تصویر جس میں کرشن جی بانسری بجا رہے تھے۔ مجھے دی اور کہا کہ اسے "کاپی" کرو۔ تین گھنٹے کی محنتِ شاقہ کے بعد جو تصویر میں نے بنائی، اسے دیکھ کر استاد نے کہا کہ اس میں صرف بانسری ٹھیک بنائی ہے! ان دنوں امتحان میں lettering کے دس نمبر علاحدہ ہوتے تھے۔ سو بحمد اللہ! خوش خطی کے ہمیشہ دس میں سے دس نمبر حاصل کئے۔ اسکول اور کالج سے نکلنے کے بعد زندگی نے جتنے بھی ٹیڑھے سوال کئے۔ ان کے جواب ہم نے ہمیشہ غلط ہی دیے۔ لیکن خوش خطی کے پورے نمبر حاصل کئے۔ عزیزو! کامیابی و ناکامی، فتح و شکست اور کامرانی و نامرادی تو نوشتۂ تقدیر کے علاوہ اور بھی بہت سے عوامل اور اتفاقات پر منحصر ہے۔ لیکن زندگی کو خوش سلیقگی، خوش نظری اور خوش دلی سے گزار لے جانا اور خارزارِ ہستی سے اپنی کلاہ کج کیے خوش گزراں، نغمہ زناں اور رقص کناں گزرنا ہر ایک کے اختیار میں ہے۔ نشاطِ کار ہم سے دنیا کی کوئی طاقت نہیں چھین سکتی۔

بات گھڑے سے شروع ہوئی تھی گھڑے پر ہی ختم کرنا چاہوں گا۔ آزادی سے پہلے میں

راجستھان میں جے پور کے ایک ضلع شیخاواٹی میں ڈپٹی کمشنر تعینات تھا۔ ایک دن میں دورے پر قصبہ اودے پور توراواٹی پہنچا جو راجپوت ٹھاکروں کی ایک جنگ جو سنتان بھومیا کا گڑھ تھا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ جیسے گھڑے میں زمانۂ طالب علمی میں کاغذ پر بناتا تھا۔ بالکل ویسے ہی گھڑے قصبے سے ذرا دور پر ایک دکان میں سجے ہیں۔ شکلاً لمبوترے اور چار فٹ اونچے تھے۔ عام گھڑوں کی دکانیں کمہار واڑے میں تھیں۔ سررشتہ دار نے بتایا کہ بھومیا راجپوت بہت جری، غیور اور سفاک ہوتے ہیں۔ کسی کے ہاں بیٹی پیدا ہوتی ہے تو وہ اسے ایسے ہی گھڑے میں بند کر کے زندہ دفن کر دیتا ہے۔ مجھے ان گھڑوں سے نفرت کا ایک اور جواز مل گیا۔ حال ہی میں، میں نے چند خواتین آرٹسٹوں کی روغنی تصویریں دیکھیں جن کا مرکزی موضوع عورت کی محرومیت، استحصال، زبوں حالی اور مظلومیت کی مختلف صورتیں اور دردناک پہلو تھے۔ تین تصویریں گمبھیر رنگوں میں کاروکاری پر بھی تھیں۔ انھیں دیکھ کر مجھے وہ خونی گھڑے بے طرح یاد آئے جنھیں میں زمانۂ طالب علمی میں ان جانے میں بنایا کرتا تھا اور جواب میرے لئے صرف عورت کی ازلی مظلومیت کا سمبل بن کر رہ گئے ہیں۔

شاہد عزیز صدیقی صاحب نے گزشتہ ہفتے ازراہ کرم مجھے اسکول کے مختلف شعبوں کے فائنل سال کے طلبہ وطالبات کے شاہکار دکھائے تو میری نگاہیں اپنے منحوس گھڑے اور کھٹے انگور تلاش کرتی رہیں۔ کیسے بتاؤں کہ انھیں نہ پاکر مجھے کتنی خوشی ہوئی۔ نئی ذہین نسل اب ان گھڑ گھڑوں اور کھٹے انگوروں کی منزل کو پیچھے، بہت پیچھے چھوڑ آئی ہے۔ خدا انھیں خوش رکھے۔ اسکول کے نوجوان آرٹسٹوں کی فکر ونظر کی انفرادیت، تازہ کاری، ذکاوت اور جودت رنگوں اور خطوط میں جھلکتی ہے۔ پینٹنگ پر ہی موقوف نہیں۔ کیمونی کیشنز اور مجسمہ سازی کے نمونوں میں بھی چوکنا سماجی شعور اور جہاں تہاں غیر مبہم اور تند وتیز Statement یعنی کلمۂ اعلائے مدعا نظر آتا ہے جو چونکا دیتا ہے۔ ایک دور قدغن ایسا بھی گزرا ہے۔ جب آرٹ میں ایسے ادّعا وابلاغ پر بعض بزرگ ناک بھوں ہی نہیں، آستینیں بھی چڑھا لیتے تھے لیکن آرٹ اپنی تمام ترنمو اور توانائی زندگی اور اس کے مظاہر ومسائل سے حاصل کرتا ہے۔ آرٹ منی پلانٹ کی مانند نہیں ہوتا جو بغیر زمین، بغیر کھاد، بغیر بیج، بغیر جڑ اور بغیر دیکھ ریکھ کے خوب بڑھتا اور پھیلتا ہے۔ فن کار رزمِ خیر وشر میں خاموش تماشائی کی حیثیت سے ایک

محفوظ فاصلے پر کھڑا نہیں رہ سکتا۔ دانتے کہتا ہے کہ جہنم کا گرم ترین طبق ان لوگوں کے لئے مخصوص ہوگا جو معرکہ حق و باطل میں غیر جانب دار رہتے ہیں۔

میں بھٹک کر کہاں سے یہاں آنکلا۔ ارادہ تو یہ تھا کہ اپنی گفتگو کا آغاز اس خوش خبری کے ساتھ کروں گا کہ خواہ میری باتیں بے ربط اور اکھڑی اکھڑی معلوم ہوں لیکن تنبیہ و موعظت اور پند و نصیحت سے بہر صورت خود کو باز رکھوں گا۔ حفیظ جالندھری کا شعر ہے:۔

ہیں یاد مجھے آج بھی ایامِ جوانی
میں آج بھی اوروں کو نصیحت نہیں کرتا

اتنی وضاحت کرتا چلوں کہ آتش جوانی میں بھی ایسا ہی تھا جیسا کہ اب ہے بلکہ معتبر دیکھنے والے کہتے ہیں کہ اب بہتر لگتا ہے!

میں نے زندگی میں ایک ہی کنووکیشن ایڈریس بدرجۂ مجبوری اپنی گریجویشن کی تقریب میں سنا ہے۔ اس کا سن اور تاریخ اس لئے نہیں بتاؤں کہ اسے بتاتے ہی آپ میری تقریر سننے کے بجائے میری عمر کا حساب لگانے میں الجھ جائیں گے۔ میں آپ کو بھری محفل میں مینٹل آرتھمیٹک کے عذاب میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا۔ تو عرض یہ کرنے چلا تھا کہ اس ایڈریس میں حسبِ معمول اتنی اور ایسی نصیحتیں کی گئی تھیں کہ اگر ہم واقعی ان پر عمل کرتے تو کہیں کے اور کسی کام کے نہ رہتے۔ مطلب یہ کہ صرف دوسروں کو نصیحت کرنے کے لائق رہ جاتے اور لوگ ہماری زندہ مثال سے عبرت پکڑتے۔ یہ سچ ہے کہ اپنی پیشہ ورانہ اور بیسہ ورانہ خواری میں شائبۂ خوبیِ تقدیر کے علاوہ کچھ ہماری نیم رضا کو بھی دخل تھا:

کج شہر دے لوک وی ظالم سن
کج مینوں مرن دا شوق وی سی

اس دن ہمیں دنیائے دنی، آشوبِ زندگی اور آنے والے دنوں سے اتنا ڈرایا گیا تھا کہ مستقبل کی دہشت دل میں ایسی بیٹھی کہ آج بھی کبھی بے تحاشا جی چاہتا ہے کہ حال اور مستقبل کو دھتا بتا کے بقیہ عمرِ عزیز ماضی اور ذکرِ ماضی میں گزار دیں۔

کسی دانا کا قول ہے (یہاں اشارہ اپنی ہی طرف نہیں ہے) کہ انسان کے حق میں یہ کہیں

بہتر اور پُر مسرت ہوتا کہ وہ پیدائش کے وقت اسّی برس کا ہوتا۔ پھر بتدریج ستر، ساٹھ، پچاس سے کم ہوتے ہوتے منہ میں چسنی لیے جہانِ فانی سے رخصت ہوتا! صاحبو، کیسے مزے کی ہوتی وہ زندگی جس میں انسان بوڑھے سے جوان، جوان سے نوجوان اور نوجوان سے معصوم بچہ ہوتا چلا جاتا!

نصیحتوں، تنبیہوں اور ڈراووں سے لبریز وہ کنووکیشن ایڈریس سن کر میں نے وہیں تہیہ کرلیا کہ زندگی میں اب دوبارہ کوئی کنوکیشن ایڈریس نہیں سنوں گا۔ چنانچہ ایم اے اور ایل ایل بی کی ڈگریاں لینے تقسیمِ اسناد کے جلسے میں نہیں گیا۔ میرے سان گمان میں نہیں تھا کہ ایک دن یعنی آج کے دن مجھے علمی ایذارسانی کا یہ بظاہر خوش گوار فریضہ انجام دینا پڑے گا۔ میں کوشش کروں گا کہ بزرگانہ پند و نصیحت اور آپ کی یا قوم کی اصلاح کا کوئی پانچ سالہ منصوبہ معرضِ گفتگو میں نہ آنے دوں لیکن اگر بے دھیانی میں کوئی کلمۂ خیر یا اصلاحی فقرہ زبان پر آجائے تو اسے انسانی کم زوری سمجھ کر معاف کردیجیے گا۔ بندہ بشر ہے، خواہ بلکہ بالخصوص بزرگ ہی کیوں نہ ہو۔

صاحبو! اگلے وقتوں کے لوگ، جن میں اپنا شمار کرتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ درحقیقت خود ناقابلِ اصلاح ہوتے ہیں...... قطع نظر اس سے کہ ان کا تعلق کاروباری پیشوں سے ہے یا فن اور شعر و ادب کے میدان سے۔ ان کے ساتھ نباہ کرنا نئی نسل کے لئے مشکل تر ہوتا جا رہا ہے۔ کوئی سو برس قبل اکبرالٰہ آبادی نے کیسے پتے کی بات کہی تھی:

بوڑھوں کے ساتھ لوگ کہاں تک وفا کریں
لیکن نہ موت آئے تو بوڑھے بھی کیا کریں

کچھ لوگ اپنے اندازِ فکر، طرزِ بود و باش اور آداب و اقدار کی صحت و صداقت پر اس درجہ یقین رکھتے ہیں کہ اس سے سرِ مو اختلاف یا فنی جدت اور فکری اجتہاد کو قربِ قیامت کی نشانی تصور کرتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ نئی نسل ان کی کج کلاہی کے سامنے اسی طرح اپنا قبلہ راست کرے جس طرح انھوں نے اپنی پیش رُو نسل کے سامنے کیا تھا۔ اگر وہ سلام کا جواب اس طرح دیں جیسے سلامی لے رہے ہوں تو یہ ان کی عاداتِ راسخہ کے علاوہ ان کا روایتی حق بھی بنتا ہے۔ میری عمر اور نسل کے لوگ عرصۂ دراز سے ''وعلیکم السلام'' ہی کہتے آئے ہیں۔ ایسی ہی شان اور طنطنے والے ایک بزرگ

کے بارے میں سنا ہے کہ جب وہ قبرستان میں داخل ہوتے تو ''السلام علیکم، یا اہل القبور'' کہنے کی بجائے ''وعلیکم السلام'' لیٹے رہیے، لیٹے رہیے'' کہتے تھے۔

آپ کو ایسے بقراط art critics کی صورت میں آرٹ کی دنیا میں بھی وعلیکم السلام کہتے ملیں گے۔ انھیں ہمارا بھی سلام پہنچے۔

جلسہ تقسیم اسناد کا خطبہ بالعموم انگریزی میں ہوتا ہے مجھے اس کا بخوبی علم اور احساس ہے کہ ہمارے دفتروں، عدالتوں، درس گاہوں، کلبوں اور سنجیدہ سیمینارز میں غلط انگریزی کو صحیح اردو پر ترجیح دی جاتی ہے۔ ہمیں تو اردو میں بس ایک ہی بنیادی خرابی نظر آتی ہے۔ وہ یہ کہ آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے۔ اور سب کی سمجھ میں آجاتی ہے۔ اسی دلآویز و دل کشا خرابی کی بنا پر میں نے اس میں اظہار خیال کا فیصلہ کیا جس پر میں نہ شرمندہ ہوں، نہ معذرت خواہ۔

علامہ اقبال نے جو بات شعر کے بارے میں کہی ہے۔ اس کا اطلاق پوری صداقت کے ساتھ دیگر فنونِ لطیفہ پر بھی ہوتا ہے۔ مولانا گرامی کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ ''جہاں اچھا شعر دیکھو، سمجھ لو کہ کوئی نہ کوئی عیسیٰ مصلوب ہوا ہے۔'' اسی خیال کو ''مسجدِ قرطبہ'' میں دوسرے پیرائے میں بیان کیا ہے:

رنگ ہو یا خشت وسنگ، چنگ ہو یا حرف صوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

شاعر اور فنکار جب تک سرد و گرم زمانہ اور کربِ آگہی سے نہ گزرے وہ کوئی جان دار فن پارہ تخلیق نہیں کر سکتا۔ پکاسو کہتا ہے کہ ''پینٹنگ درحقیقت نابینا لوگوں کا پیشہ ہے! آرٹسٹ، جو کچھ دیکھتا ہے وہ پینٹ نہیں کرتا بلکہ جو کچھ محسوس کرتا ہے، اسے کینوس پر متشکل کر دیتا ہے۔'' قلم ہو یا موقلم، جب تک ''انگلیاں فگار اپنی خامہ خوں چکاں اپنا'' نہ ہو بات نہیں بنتی۔

گوئٹے کا شیطان کہتا ہے کہ ''یہ طلسمی مشروب پینے کے بعد تمہیں ہر عورت ہیلن نظر آئے گی۔'' میں سمجھتا ہوں کہ سچا فن کار اس سے بھی بڑا معجزۂ فن دکھاتا ہے۔ جب اس کا قلم یا برش کاغذ یا کینوس کو چھوتا ہے تو ہر چہرہ ہیلن کا چہرہ نظر نہیں آتا، بلکہ اس کا اور صرف اسی کا نظر آتا ہے۔ جس کا وہ

واقعتاً ہے۔ جب ہر چہرے میں ہیلن نظر آنے لگے تو یہ پینٹ اور برش کا اعجاز نہیں، بلکہ گمان غالب ہے کہ یہ اسکاچ وِسکی کا کرشمہ ہے یا زندگی اور شریکِ زندگی سے فرار کا شاخسانہ۔

واماندگی شوق تراشے ہے پناہیں

فن کار ہو یا فکشن نگار، اس کے کمالِ فن کو پرکھنے کی کسوٹی یہ ہے کہ جو کچھ اس نے خود دیکھا اور محسوس کیا، اسے وہ دوسروں کو اسی شدتِ احساس کے ساتھ دکھلا سکا ہے یا نہیں۔ رینوا (Renoir) سے کسی نے پوچھا کہ آپ کی nudes کی جلد کا رنگ روپ بالکل اصلی معلوم ہوتا ہے، اس کا کیا راز ہے؟ وہ ریاض اور مشق و مزاولت کا قائل تھا۔ اس نے جواب دیا کہ میں مستقل پینٹ کیے جاتا ہوں۔ جب کینوس پر جلد کا رنگ texture اور گداز ایسا ہو جائے کہ بے اختیار چٹکی لینے کو جی چاہے تو میں مطمئن ہو جاتا ہوں کہ تصویر ٹھیک بنی ہے۔ دیکھیے استادِ فن اور امیچور میں یہی فرق ہے۔ امیچور اصل کے چٹکی لینے کو ترجیح دیتا ہے!

فائنل کے طلبہ کے شاہکاروں کے "تھیسس ڈسپلے" میں جہاں Contemporary یعنی عصری اور تازہ بہ تازہ، نو بہ نو موضوعات پر کام دیکھ کر خوشی ہوئی وہاں چند موضوعات سے عدم دلچسپی اور نامحرم والی بے نیازی دیکھ کر اور زیادہ خوشی ہوئی۔ علامہ اقبال نے آج سے کم و بیش ستّر برس پیشتر برصغیر کے فن کاروں اور لکھنے والوں سے گلہ کیا تھا:

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس

آہ بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

سنا ہے اس پر سعادت حسن منٹو نے یہ فقرہ کسا تھا کہ مرد کے اعصاب پہ عورت نہیں تو کیا ہاتھی گھوڑے سوار ہوں گے؟ بہر حال، میں نے تو اسٹوڈیوز اور گیلریز میں ہاتھی گھوڑے بھی نہیں دیکھے! تفنن برطرف، جیسا کہ میں نے ذرا دیر پہلے عرض کیا، یہ امر باعثِ طمانیت اور انبساط ہے کہ پینٹنگ اور دیگر شعبوں کے علاوہ Sculpture یعنی مجسمہ سازی میں سب سے تیز اور بلند بانگ سوشل اور سیاسی کمنٹ نظر آتا ہے۔ وہاں جانے اور آسانی سے پہچانے جانے والے حریفوں کے دو مجسمے دیکھے جن کے ایک ہاتھ میں پھول اور دوسرے میں پستول ہے۔ ڈوری کھینچنے سے یہ کٹھ پتلی نما

مجسمے ایک دوسرے کو باری باری پھول پیش کرتے اور پستول دکھاتے ہیں۔ اسی طرح دو چہروں والے جنگجوؤں کی صفیں کسی عنوان یا تشریحی نوٹ کے بغیر اپنا رزمیہ سنا دیتی ہیں۔

آرکی ٹیکچر میں قابلِ رشک اختصاص و شغف کا اندازہ نوشیرواں جی بلڈنگ کی تجدید و تعمیر مکرر مطابق اصل سے ہوتا ہے۔ روایت ہے کہ حضرت سلیمان کے حکم کی تعمیل میں ایک قوی ہیکل جن پلک جھپکتے میں ملکۂ سبا کو تخت سمیت اٹھا یا تھا۔ لیکن ہمارے جناتی آرکی ٹیکٹ تو پورا محل جوں کا توں اٹھا لائے۔ اگر اس میں کوئی ملکہ عالیہ زندہ یا مردہ حالت میں ہوتی تو عجب نہیں کہ اس عفیفہ کو بھی تاج وتخت یا تابوت سمیت لا کے یہیں کسی درشن جھروکے میں بٹھا دیتے۔ صاحبو! اینٹ سے اینٹ بجانے کا محاورہ تو سنتے آئے تھے جس کے معنی ہیں بالکل تباہ و برباد کر کے نام و نشان مٹا دینا۔ آپ نے تو سو سال پرانی اینٹ سے اینٹ جوڑنے کا عالی شان نمونہ شہرِ قائد کے قلب میں کھڑا کر دیا!

جرمن فلسفی شیلنگ (Joseph Von Schelling) نے آرکی ٹیکچر کو frozen music یعنی منجمد موسیقی سے تعبیر کیا ہے۔ یہ تاریخی عمارت اپنی نغماتی کہانی اپنی زبانی سناتی ہے۔ ہم اسے جلترنگ کے وزن پر سنگ ترنگ کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔

اس عمارت کی انوکھی تنصیب اور تعمیرِ ثانیہ سے قدیم عمارتوں کے حسن، قدر و منزلت اور تاریخی اہمیت کا اندازہ اور اعادہ ہوتا ہے۔ یہ ایسا کارنامہ ہے جس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہوگی۔ تنہا اسی عمارت پر منحصر نہیں۔ کراچی میں Renaissance اسٹائل کی خوبصورت عمارتیں اور Gothic طرز کی نازک عمارتیں کب سے ہماری داد و توجہ کی طالب و منتظر کھڑی ہیں۔ وہ اپنے حسن اور دل کش خطوط کی داد وصول کرنے کے لئے اسٹیج پر مٹک مٹک کے Cat Walk نہیں کر سکتیں۔ خود ہمیں ان کے سامنے نگاہ روبرو، باادب باملاحظہ گزرنا چاہیے۔ جو ادارے اور درس گاہیں اس شہر اور اس کے ماضی اور آثارِ قدیمہ کی قدر کرنا سکھاتے ہیں۔ وہ ایک ثقافتی فرضِ کفایہ انجام دیتے ہیں۔ ایک ایسا فرض جس کی ادائیگی وہ انشراح و انبساط بخشتی ہے جو کسی طور عیشِ فراواں سے کم نہیں۔ آخر عیش کسے کہتے ہیں؟ اس کی تعریف غالبؔ نے تفتہؔ کے نام اپنے ایک خط میں کی ہے جسے اس بارۂ خاص میں حروفِ آخر سمجھنا چاہیے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

سنو صاحب، جس شخص کو جس شغل کا شوق ہو اور وہ اس میں بے تکلف عمر بسر کر کے اس کا نام عیش ہے۔

کراچی کی عمارتیں نہ اتنی قدیم ہیں جتنی کہ یونان اور روم کی نہ اتنی پراچین جتنے کہ اشوک کے استوپا، لیکن خوبصورت ہونے کے لئے چہرے پر جھریاں ہونی ضروری نہیں۔ امریکہ میں تو ستر سالہ عمارت قدیم تصور کی جاتی ہے اور اس کے ساتھ بزرگوں کا سا سلوک کرتے ہیں یعنی حقارت آمیز۔ امریکہ کے پاس بہترین جغرافیہ اور مختصر ترین تاریخ ہے جو اتنی تازہ ہے کہ اس پر حالاتِ حاضرہ کا گمان ہوتا ہے۔

کراچی کی عمارتوں کے آرکی ٹیکچر سے واقفیت اس لئے ضروری ہے کہ ماڈرن آرکی ٹیکچر ابھی اپنا سراپا اور قابلِ قبول لب ولہجہ دریافت نہیں کر پایا ہے۔ اسے آدھا تیتر آدھا بٹیر بھی نہیں کہا جا سکتا۔ ویسے ہمیں آدھے تیتر آدھے بٹیر پر بھی کوئی اعتراض نہیں۔ بشرطیکہ دونوں ہماری پلیٹ پر ہوں۔ اس پر ہمیں ایک واقعہ یاد آیا۔ مرحوم رزقی جن کی تصویر آپ کے ہال میں آویزاں ہے۔ بڑے بانکے اور طرح دار آرکی ٹیکٹ تھے۔ ایک دفعہ میرے بہت ہی عزیز دوست میاں فضل حسن ان سے میرے مکان کا نقشہ بنوانے گئے۔ مجھے محض دُسراتھ کی خاطر لے گئے۔ وہ کلاسیکی مزاج کے آدمی تھے۔ رزقی صاحب نے ایک رف اسکیچ بنا کر دکھایا تو فضل صاحب کہنے لگے کہ اس میں تھوڑا سا مغل آرکی ٹیکچر کا ٹچ دیجیے۔ دو تین خوبصورت محرابیں، ایک آدھ آرائشی طاق اور کہیں سنگِ مرمر کی خوبصورت سی جالی۔

رزقی صاحب نے اپنا اسکیچ فوراً پھاڑ دیا اور بولے، ''آپ یوسفی صاحب کا مکان بنوانے آئے ہیں یا مقبرہ؟''

قدیم عمارتیں ہر اعتبار سے قومی اثاثہ اور ورثہ ہیں۔ وہ اس شہر اور قریے کا زیور ہیں جہاں وہ ہیں۔ وہ ایسی ہی توجہ اور دیکھ ریکھ کا مطالبہ کرتی ہیں جو نازک زیورات سے مختص ہے۔ ہر عمارت اپنے عہد کا آئینہ ہوتی ہے۔ اپنے اداشناسوں سے کلام کرتی، دامنِ دل کو کھینچتی اور غور و تدبر پر آمادہ کرتی ہے۔ موئن جوڑو کی نرتکی کھنڈرات سے نکل کر اپنی کتھا سناتی اور نرت بھاؤ دکھاتی ہے۔ معروف،

نیل اس عہد کے فن نقاشی کی تنومند علامت بن جاتا ہے۔

آر کی ٹیکٹ سنگ و خشت سے اپنے خواب کی تعبیر تعمیر کرتا ہے۔ وہ کیا دیکھتا اور دکھاتا ہے۔ سنگِ سادہ کو اعجاز کا رنگ کیسے دیتا ہے۔ اس کی تصویر ہنگیرین آرٹسٹ Breuer نے بڑے دل کش انداز سے کھینچی ہے۔

Colour which you can see with ears: sounds to see with eyes: the void you touch with your elbow: the taste of space on your tongue: the fragrance of dimensions:the Juice of stone.

اب اسے ایک فقیرِ بے ریا و ریش کی بے خبری کہیے یا ایک پیشہ ور سود خور کی مصلحت اندیشی کہ میں نے قومی و معاشی مسائل اور حالاتِ حاضرہ پر اظہار خیال کرنے سے عمداً گریز کیا۔ اس موضوع پر میں نے ایک جامع اور مانعِ سرزنش جملہ گھڑ رکھا ہے جس میں دانائی سے زیادہ ملازمانہ روش احتیاط ٹپکتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ "دنیا جہان میں جہاں بھی، جو کچھ ہو رہا ہے، اور ہوتا رہا ہے، وہ ہماری اجازت و ایماء کے بغیر ہوا اور ہو رہا ہے۔" اس کا اطلاق ہر اس صورتِ حال پر ہوتا ہے جو کبھی موجودہ کہلاتی تھی۔

نظر آتی ہی نہیں صورتِ حالات کوئی
اب یہی صورتِ حالات نظر آتی ہے

دیکھیے، میں نے پھر خود اظہارِ خیال کرنے کی بجائے شمع حفیظ جالندھری کے سامنے رکھ دی۔ یہ بھی اظہار و ابلاغ کی ایک محتاط صورت ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ آرٹسٹ گوگاں نے بھی تو محبوبہ کو اپنی پینٹنگ پیش کرنے کے بجائے ریزر سے اپنا کان کاٹ کر پیش کرنا چاہا تھا۔

معاشرے اور معیشت کے معاشی اور غیر معاشی مسائل کی موجودگی اور سنگینی سے تو میں بھی انکار نہیں کر سکتا۔ میں کوئی وزیر تھوڑا ہی ہوں لیکن یہ بھی اپنی جگہ درست ہے کہ برصغیر کا روایتی مزاج Pessimistic یعنی قنوطی اور یاس پسند رہا ہے اور لہجہ حزیں و گلوگیر، گاہے تلخ و ترش، کبھی کبھی تو ایسا لگتا ہے جیسے ایک دوسرے سے مایوسانہ باتیں کرنے میں ہمیں مزہ آتا ہے۔ ہمیں اس کا احساس تک نہیں کہ منفی، شکی اور عیب جُو رویہ ہمارے مزاج کا حصہ بن گیا ہے۔ ہم روشن مستقبل کو گہرے سیاہ رنگ کے سن گلاسز سے دیکھنے کے عادی ہو چلے ہیں۔ ملک کے مستقبل اور سلامتی کے بارے میں،

مایوس کن اور یاس انگیز باتیں کرنا ہمارے دانشوروں، سیاست دانوں، تبصرہ و تجزیہ نگاروں اور ڈرائنگ روم کے بقراطوں کا پسندیدہ مشغلہ بنتا جارہا ہے۔ اس پر یاد آیا کہ ادیب شہیر شاہد احمد دہلوی مرحوم کے دفتر میں ایک منشی کام کرتا تھا۔ وہ ہر وقت ہر کس و ناکس سے بیوی کی برائی کرتا رہتا تھا۔ سننے والے عاجز تھے۔ ایک دن وہ شاہد احمد صاحب سے بیوی کی بُرائی کرنے لگا تو انہوں نے پوچھا، ''منشی جی، کیا آپ کی بیوی سوتیلی ہے؟''

تو کیا ہم سوتیلے ملک کی روٹی اور نمک کھاتے ہیں؟ کبھی کبھی تو ہم اپنے وطنِ عزیز سے ایسا سلوک کرتے ہیں جیسے خاکم بدہن، یہ دشمن ملک یا دارالحرب ہو!

خواتین و حضرات! میں یہ بات حلفیہ کہنے کے لئے تیار ہوں کہ گزشتہ پچپن برس کے دوران ایک ہفتہ بھی ایسا نہیں گزرا جب کسی نہ کسی لیڈر یا امّت کے نگہبان نے یہ مژدۂ جانکاہ نہ سنایا ہو کہ ملک اس وقت بہت نازک دور سے گزر رہا ہے اور امّت پہ عجیب وقت آن پڑا ہے۔ صاحبو! یہ کیسی نزاکت ہے جو پچپن برس سے مسلسل چلی آرہی ہے۔ یہ تو بڑی مضبوط اور مستحکم قسم کی نزاکت معلوم ہوتی ہے۔ وہ پے در پے کرائسس اور دائمی بحران جس سے ہم نصف صدی سے ڈرائے جارہے ہیں، بحمداللہ ملک و قوم کا کچھ نہ بگاڑ سکے اور نہ کبھی بگاڑ سکیں گے۔ اس لئے کہ یہ نظریاتی ملک، جس کا خواب ہمارے پرکھوں نے دیکھا، سدا قائم اور پائندہ و تابندہ رہنے کے لئے بنا ہے۔ فن کار کے لئے مایوسی ہی نہیں، بے حسی بھی حرام ہے۔ وہ جاوداں، پیہم رواں، ہر دم جواں زندگی کا عکاس، نقاش اور صورت گر ہے۔ مولانا روم فرماتے ہیں کہ میں روشنی کے سرچشمے کا پرستار ہوں۔ ہر طرف روشنی ہی روشنی دیکھتا ہوں۔ میں شب اور ظلمتِ شب کی پرستش نہیں کرتا۔ نہ خواب کا احوال بیان کرتا ہوں:

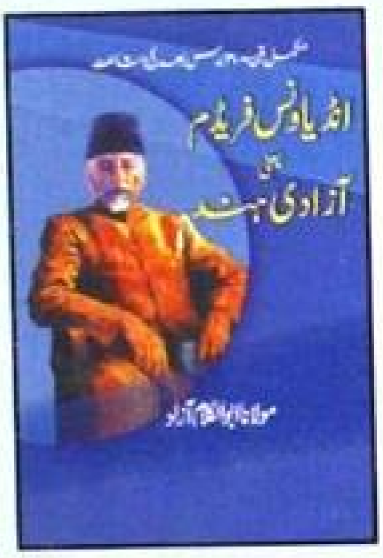
چو غلامِ آفتابم، ہمہ آفتاب بینم
نہ شبنم، نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم

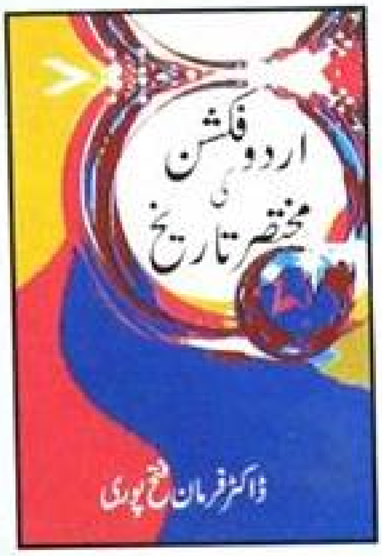
☆☆☆

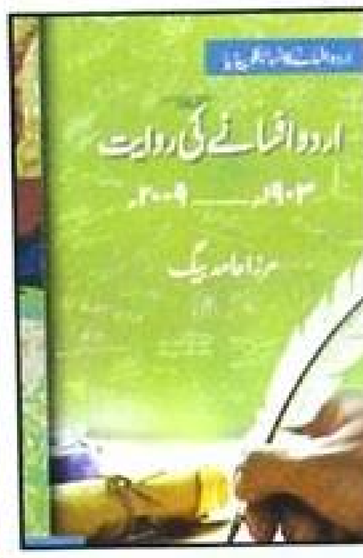
پسِ نوشت

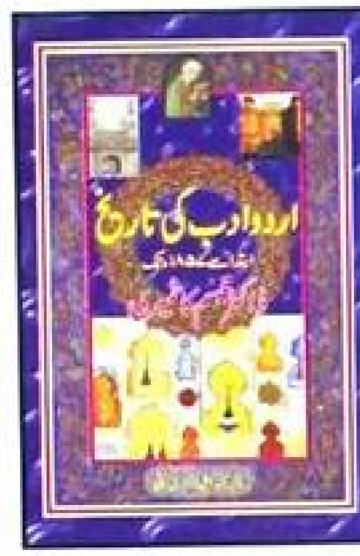
یہ کتاب ابھی طباعت کے مراحل سے گزر رہی تھی کہ کراچی سے مژدۂ جانفزا آیا کہ مشتاق احمد یوسفی کی پانچویں کتاب ''شامِ شعر یاراں'' زیورِ طبع سے آراستہ ہوگئی ہے۔ بہ اتفاق ہماری کتاب میں شامل تینوں مضامین اس میں موجود ہیں۔ چنانچہ اسے قندِ مکرر سمجھیں اور لطف اندوز ہوں۔

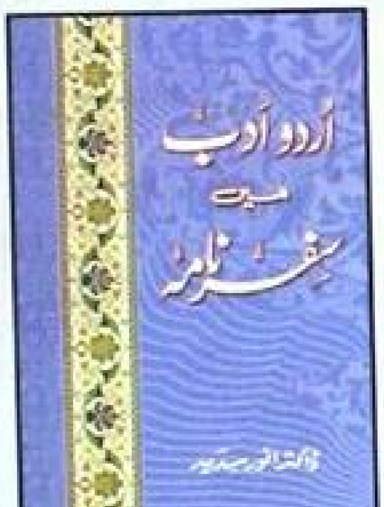
مظہر احمد

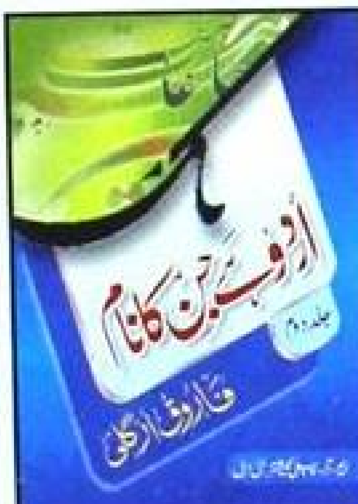
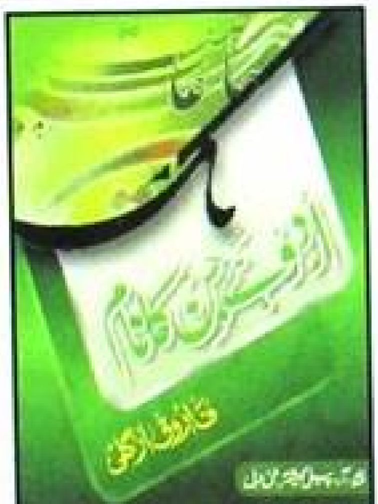
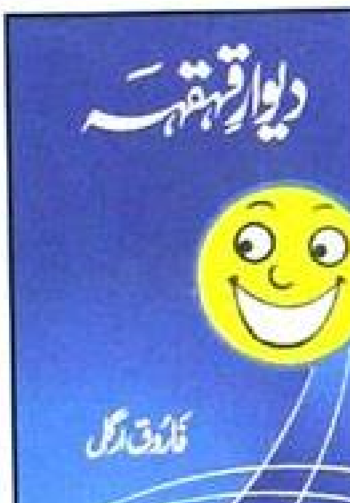


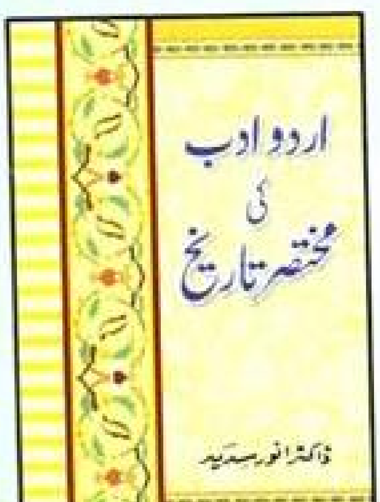


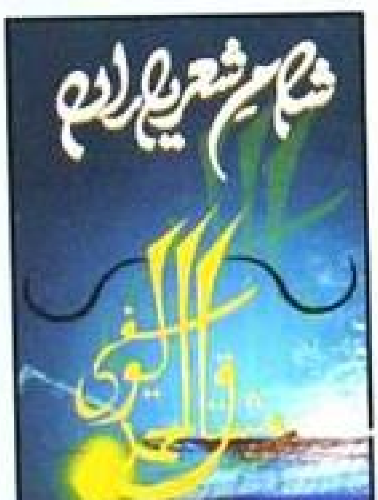
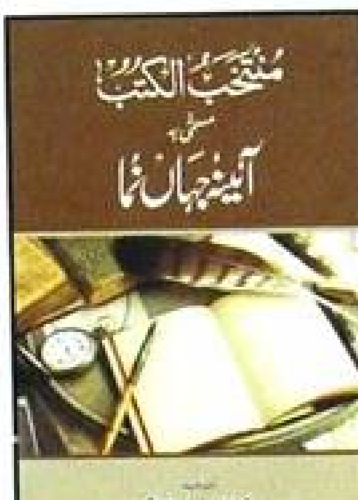


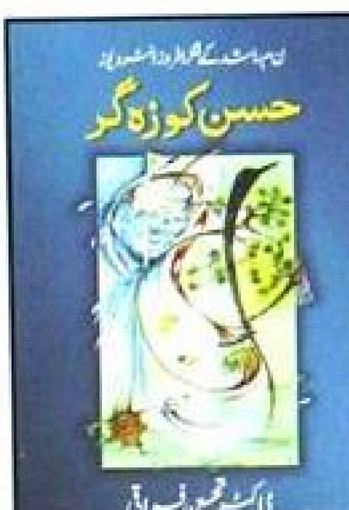


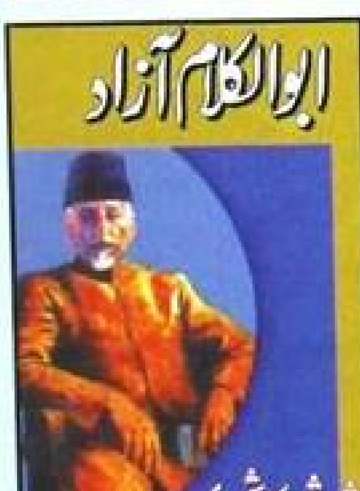


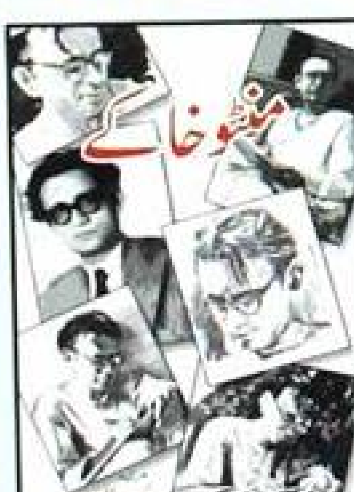




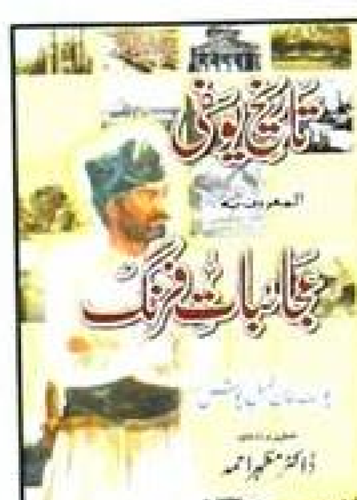












M.R.Publications

Printers, Publishers, Suppliers & Distributors of Literary Books

10 Metropole Market, 2724-25 First Floor
Kucha Chelan, Daryaganj, New Delhi-110002
Cell: 09810784549, 09873156910 E-mail: abdus26@hotmail.com

ISBN 93-83282-50-9